5
محبت علی علیہ السلام
آیت اللہ شہید استاد مرتضیٰ مطہریؒ
شہید مطہری فاونڈیشن (پاکستان)
www.shaheedmutahhari.com

محبت علی علیہ السلام

(جاذبہ ودافعہ علیؑ)

مؤلف

شہید مرتضیٰ مطہری

مترجم

غلام حسین سلیم

ناشر

معراج کمپنی لاہور

نام کتاب.................................... جاذبہ و دافعۂ علی علیہ السلام
مؤلف .... شہید مرتضیٰ مطہری
مترجم .... غلام حسین سلیم
پروف ریڈنگ و تصحیح.................................... مجاہد حسین حرؔ
کمپوزنگ.................................... قائم گرافکس ۔جامعہ علمیہ۔ڈیفنس فیز ۴
ناشر .... معراج کمپنی لاہور
ہدیہ ....

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔لاہور

03214971214،04237361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد۔ 03335234311

انتساب

مولائے کائنات

حضرت علی علیہ السلام

سے محبت کرنے والوں

کے نام

عرض ناشر

حمد ہے اس ذات کے لئے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا اور درود وسلام ہو اس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جسے اس نے عالمین کے لئے سراپا رحمت بنا کر مبعوث فرمایا اور سلام ورحمت ہو ان کی آل پر جنہیں اس نے پورے جہاں کے لئے چراغ ہدایت بنایا۔

حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں محبت مولائے کائنات مومن کے لئے جزو ایمان قرار دیا گیا۔ اور محبت علیؑ انسان کے اندر کن خوبیوں کو بیدار کرتی ہے اور کن بری عادات کو انسان سے دور کرتی ہے یہ جاننے اور سمجھنے کے لئے شہید مطہری کی اس کتاب کا مطالعہ بہت ہی مفید ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے لئے ہم حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ محسن نجفی کے مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنی اور اپنے ادارے کی تمام کتب کی اشاعت کے لئے ہمیں اجازت دی۔ خداوند عالم موصوف کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

ہم نے موجودہ کتاب کی اشاعت کا اہتمام اس نسخہ سے کیا ہے کہ جو شیخ محترم کے جامعۃ الکوثر سے شائع ہوا تھا۔ اس کے لئے ہم کتاب کے مترجم جناب غلام حسین سلیم صاحب، اس کی کمپوز و پروف کے مراحل کو مکمل کروانے پر مجاہد حسین حرّ صاحب کے مشکور ہیں اور خداوند قدوس کی بارگاہ میں دعا گو ہیں کہ وہ ان علمائے کرام کو اپنے حفظ امان میں رکھے۔

ادارہ

فہرست کتاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

امیر المومنین علی علیہ السلام کی عظیم اور ہمہ گیر شخصیت اس سے کہیں زیادہ وسیع اور پہلودار ہے کہ کوئی اس کے تمام پہلوؤں کو مکمل طور پر سمجھ سکے اور فکر کے گھوڑے دوڑائے۔ ایک فرد زیادہ سے زیادہ جو کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک یا چند مخصوص اور محدود پہلوؤں کو مطالعہ اور غور و فکر کے لئے منتخب کرے اور اسی پر قانع ہو۔

اس عظیم شخصیت کے وجود کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک مختلف انسانوں پر اس کا مثبت یا منفی اثر ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا وہ طاقتور جاذبہ اور دافعہ ہے، جو اب بھی اپنا بھرپور اثر دکھاتا ہے اور اس کتاب میں اسی پہلو پر گفتگو ہوئی ہے۔

انسانی روح و جان میں ردعمل پیدا کرنے کے نقطۂ نظر سے افراد کی شخصیت یکساں نہیں ہے۔ جس نسبت سے شخصیت حقیر تر ہوتی ہے اتنا ہی کمتر خیالات کو وہ اپنی طرف کھینچتی اور دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرتی ہے اور جتنی شخصیت عظیم تر اور طاقت ور ہوتی ہے اتنی ہی فکر انگیز اور رد عمل پیدا کرنے والی ہوتی ہے خواہ ردعمل موافق ہو یا مخالف۔

فکر انگیز اور رد عمل پیدا کرنے والی شخصیات کا ذکر زبانوں پر زیادہ آتا ہے۔ بحث و مباحثہ اور اختلافات کا موضوع بنتی ہیں۔ شاعری، نقاشی اور دیگر فنون لطیفہ کا افتخار بنتی ہیں۔ داستانوں اور کہانیوں کا ہیرو قرار پاتی ہیں۔ یہی تمام چیزیں ہیں جو علی علیہ السلام کے بارے میں بہ درجۂ اتم موجود ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا کوئی رقیب ہی نہیں یا بہت کم ہیں۔ کہتے ہیں کہ محمد ابن شہر آشوب مازندرانی جو ساتویں صدی کے اکابر علمائے امامیہ میں سے ہیں، جب اپنی مشہور کتاب

مناقب تالیف کر رہے تھے، اس وقت ان کے کتب خانے میں مناقب کے نام سے ایک ہزار کتابیں تھیں جو سب علی علیہ السلام کے بارے میں لکھی گئی تھیں۔

اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولا علی علیہ السلام کی بلند شخصیت نے تاریخ کے دھارے میں کتنے ذہنوں کو مشغول رکھا!

علی علیہ السلام اور ان تمام لوگوں کا جو حق کی روشنی میں منور ہیں، بنیادی امتیاز یہ ہے کہ وہ ذہنوں کو مشغول رکھنے اور افکار کو سرگرم کرنے کے علاوہ دلوں اور روحوں کو روشنی، حرارت، عشق و مستی اور ایمان واستحکام بخشتے ہیں۔

سقراط، افلاطون، ارسطو، بوعلی سینا، ڈیکارٹ جیسے فلسفی بھی افکار کو تسخیر کرنے اور ذہنوں کو سرگرم کرنے والے سپوت ہیں۔

علاوہ ازیں سماجی انقلابات کے رہنماؤں نے خاص کر آخری دو صدیوں میں اپنے پیروکاروں میں ایک طرح کا تعصب پیدا کیا ہے۔ مشائخ عرفان اپنے پیروکاروں کو غالباً تسلیم کے اس مرحلے تک پہنچا دیتے ہیں کہ اگر پیر مغاں اشارہ کر دے تو وہ جائے نماز کو مے سے رنگیں کر دیں۔ لیکن ان میں سے کسی میں بھی گرمی و حرارت کے ساتھ ساتھ وہ نرمی لطافت اور خلوص و رقت نہیں دیکھتے جس کا نشان تاریخ میں علی علیہ السلام کے پیروکاروں میں ملتا ہے۔ اگر صفویوں نے درویشوں کا ایک لشکر جرار منظم کر کے مؤثر جنگیں لڑیں تو ایسا علی علیہ السلام کے نام پر کیا نہ کہ اپنے نام پر۔

معنوی حسن اور خوبصورتی جو خلوص ومحبت پیدا کرتی ہے اور بات ہے اور رہنمائی، مفاد اور زندگی کی مصلحتیں جو سماجی رہنماؤں کا اثاثہ ہیں یا عقل وفلسفہ جو فلسفیوں کا اثاثہ ہیں یا اقتدار و تسلط کا اثبات جو عارف کا اثاثہ ہے، بالکل دوسری بات ہے۔

مشہور ہے کہ بوعلی سینا کے شاگردوں میں سے ایک اپنے استاد سے کہا کرتا تھا کہ اگر آپ اس غیر معمولی فہم وفراست کے ساتھ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھیں تو لوگ آپ کے گرد جمع ہو جائیں

گے اور بوعلی سینا خاموش رہتے۔ یہاں تک کہ سردیوں کے موسم میں دونوں کسی سفر پر ساتھ تھے۔ صبح کے قریب بوعلی سینا نیند سے بیدار ہوئے، شاگرد کو جگایا اور کہا کہ مجھے پیاس لگی ہے تھوڑا سا پانی لا دو۔ شاگرد نے سستی کی اور بہانے تراشنے لگا۔ ہر چند بوعلی نے اصرار کیا لیکن شاگرد اس سردی میں گرم بستر چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اسی وقت گلدستہ اذان سے موذن کی صدا بلند ہوئی۔ اللہ اکبر اشہد ان لا الہ الا اللہ۔ اشہد ان محمدا رسول اللہ۔ بوعلی نے اپنے شاگرد کو جواب دینے کے لئے موقعہ غنیمت جانا۔ کہا کہ تو جو کہتا تھا کہ اگر میں نبوت کا دعویٰ کر بیٹھوں تو لوگ میرے اوپر ایمان لے آئیں گے۔ اب دیکھ میری موجودگی میں میرا حکم تجھ پر نہیں چلتا جو سالہا سال تک میرا شاگرد رہا اور میرے درس سے فائدہ اٹھایا کہ تو ایک لحظہ کے لئے اپنا گرم بستر چھوڑے اور مجھے پانی پلائے، لیکن یہ مؤذن چار سو سال کے بعد بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی اطاعت کرتے ہوئے اپنا گرم بستر چھوڑ کر اس بلندی پر جا کر خدا کی وحدانیت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی گواہی دے رہا ہے۔

ببین تفاوتِ رہ از کجا است تا بہ کجا

جی ہاں! فلسفی شاگرد پیدا کرتے ہیں نہ کہ پیروکار۔ سماجی رہنما متعصب پیروکار پیدا کرتے ہیں نہ کہ مہذب انسان۔ اقطاب و مشائخ عرفان ارباب تسلیم پیدا کرتے ہیں نہ کہ سرگرم مومن مجاہد۔

علی علیہ السلام میں فلسفی، انقلابی رہنما، پیر طریقت اور پیغمبروں جیسی خصوصیات یکجا ہیں۔ علی علیہ السلام کا مکتب، مکتبِ عقل و فکر بھی ہے اور مکتبِ انقلاب و ارتقاء بھی۔ مکتب تسلیم ہونے کے ساتھ نظم و ضبط بھی اور مکتب حسن و زیبائی اور جذبہ و حرکت بھی۔

علی علیہ السلام دوسروں کے لئے ایک امام عادل ہونے اور دوسروں کے بارے میں عدل و انصاف کا چلن رکھنے سے پہلے خود اپنی ذات میں ایک متعادل اور متوازن وجود تھے جن میں تمام انسانی کمالات یکجا تھے۔ وہ ایک گہری اور دوررس فکر بھی رکھتے تھے۔ ساتھ ہی انتہائی نرمی اور

مہربانی کے جذبات بھی۔ یوں تمام روحانی اور جسمانی کمالات کے بہ یک وقت حامل تھے۔ راتوں کی عبادت کے دوران ماسوا اللہ دنیا سے ان کا رشتہ کٹ جاتا اور دن کو معاشرتی سرگرمیوں میں مصروف رہتے!

دن کو انسانی آنکھیں علی علیہ السلام کی ہمدردیاں اور قربانیاں دیکھتیں اور انسانی کان ان کے وعظ و نصیحت اور حکیمانہ باتیں سنتے۔ رات کو چشم ستارگان ان کے ذوق بندگی میں بہنے والے آنسو دیکھتیں اور گوش فلک ان کی عشق میں ڈوبی ہوئی دعائیں اور مناجاتیں سنتا۔ وہ مفتی بھی تھے اور حکیم بھی۔ عارف بھی تھے اور اجتماعی رہبر بھی۔ زاہد بھی تھے اور سپاہی بھی۔ قاضی بھی تھے اور مزدور بھی۔ خطیب بھی تھے اور ادیب بھی۔ غرض ہر لحاظ سے تمام خوبیوں کے ساتھ ایک کامل انسان!

زیر نظر کتاب ایسی چار تقریروں کا مجموعہ ہے جو ۱۸ تا ۲۱ ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ حسینیہ ارشاد میں کی گئی تھیں۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں عمومی طور پر جذب و دفع اور خصوصی طور پر انسانوں کے جاذبہ و دافعہ کے اصول کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ حصہ اول میں علی علیہ السلام کے اس ابدی جاذبہ جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتا رہا ہے، کے فلسفہ، فائدہ اور اثر کو موضوع قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں حضرتؑ کے اس طاقتور دافعہ کی کہ وہ کس قسم کے عناصر کو سختی سے رد کرتا اور دور پھینکتا تھا توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ علی علیہ السلام دوہری طاقت رکھتے تھے اور جو بھی ان کے مکتب میں پروان چڑھنا چاہتا ہے، اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ دوہری طاقت رکھتا ہو۔

چونکہ علی علیہ السلام کے مکتب کی پہچان صرف یہی نہیں ہے کہ دوہری طاقت ہو، اس کتاب میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ علی علیہ السلام کا جاذبہ کس قسم کے لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتا تھا اور ان کا دافعہ کس قماش کے لوگوں کو دور کرتا تھا۔ افسوس! ہم میں سے بعض جو ان کے مکتب کا پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جن کو علی علیہ السلام جذب کرتے تھے انہیں دفع کرتے ہیں۔ اور

جن کو وہ دفع کرتے تھے انہیں جذب کرتے ہیں۔ دافعہ علی علیہ السلام کے باب میں خوارج کے بارے میں بحث پر اکتفاء کی گئی ہے۔ حالانکہ اور بھی گروہ ہیں جو دافعۂ علی علیہ السلام میں شامل ہیں۔ شاید کسی اور موقعہ پر اور کم از کم کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں کتاب کے دیگر نقائص کا بھی ازالہ کیا جائے۔

تقریروں کی تکمیل اور اصلاح کی زحمت فاضل بلند وقدر جناب آقائے فتح اللہ امیدی نے برداشت کی ہے۔ نصف کتاب ان جناب کے قلم سے ہے جس کو ٹیپ شدہ کیسٹوں سے نقل کر کے ازسرنو اپنے قلم سے تحریر کیا ہے اور کہیں اصلاح یا تکمیل کی ہے۔ دوسرا نصف دیگر میرے اپنے الفاظ ہیں یا ان جناب کی اصلاح کے بعد میں نے خود بعض چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔ امید ہے کہ مجموعی طور پر اس کا مفید اثر ہوگا۔ ہم خداوند متعال سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں علی علیہ السلام کے سچے پیروکاروں میں قرار دے۔

مرتضیٰ مطہری

تہران۔۱۱، اسفند ۱۳۴۹ شمسی

مطابق ٤، محرم الحرام ۱۳۹۱ قمری

مقدمہ

قانونِ جذب ودفع

جذب ودفع کا قانون ایک عمومی قانون ہے جو پورے نظام آفرینش میں کارفرما ہے۔ تمام جدید انسانی علوم کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ کائنات ہستی کا کوئی ذرّہ کشش کے عمومی قانون کی عملداری سے خارج نہیں ہے بلکہ اس کا پابند ہے۔ عالم کے بڑے سے بڑے اجرام واجسام سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ذرات تک میں کشش (جاذبہ) کی پوشیدہ قوت موجود ہے اور کسی نہ کسی طرح اس سے متاثر بھی ہے۔

ذرّہ ذرّہ کاندرین ارض و سماست

جنسِ خود را ہمچو کاہ و کہرباست

اس زمین وآسمان کا ہر ذرّہ اپنی جنس کے لئے کاہ اور برق کی طرح ہے۔

اسے چھوڑ یئے، اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ گو تمام جمادات کے سلسلے میں قوتِ جاذبہ کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہتے تھے بلکہ صرف اس بات پر بحث کرتے تھے کہ زمین کیونکر افلاک کے درمیان ٹھہری ہوئی ہے۔ تاہم ان کا عقیدہ تھا کہ زمین آسمان کے وسط میں معلق ہے اور جاذبہ ہر طرف سے اس کو کھینچتا ہے اور چونکہ یہ کشش تمام اطراف سے ہے اس لئے قہراً درمیان میں کھڑی ہے اور کسی ایک طرف کو نہیں جھکتی۔ بعض کا عقیدہ تھا کہ آسمان زمین کو جذب

نہیں کرتا بلکہ اس کو دفع کرتا ہے اور چونکہ زمین پر یہ دباؤ تمام اطراف سے مساوی ہے نتیجتاً زمین ایک خاص نقطے پر ٹھہری ہوئی ہے اور اپنی جگہ نہیں بدلتی۔

نباتات اور حیوانات میں بھی سب جاذبہ و دافعہ کی قوت کے قائل تھے بہ این معنی کہ ان کے لئے تین بنیادی قوتوں جاذبہ (طلب غذا کی قوت) نامیہ (بڑھنے کی قوت) اور مولدہ (پیدا کرنے کی قوت) کو مانتے تھے اور قوۂ غاذیہ کے لئے چند فرعی قوتوں جاذبہ، دافعہ، ہاضمہ اور ماسکہ (روکنے کی قوت) کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ معدہ کے اندر جذب کی ایک قوت ہے جو غذا کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور جہاں غذا کو مناسب نہیں پاتی اس کو دفع [1] کرتی ہے۔ اسی طرح وہ کہتے تھے کہ جگر میں جذب کی ایک قوت ہے جو پانی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

معدہ نان رامی کشد تا مستقر
می کشد مہ آب را تف جگر
معدہ کھانے کو اور جگر پانی کو ان کے ٹھکانوں تک کھینچ لے جاتا ہے۔

انسانی دنیا میں جاذبہ و دافعہ

جذب و دفع سے مراد یہاں جنسی جذب و دفع نہیں ہے، اگرچہ وہ بھی جذب و دفع کی ایک خاص قسم ہے لیکن ہماری بحث سے مربوط نہیں ہے اور اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے، بلکہ وہ جذب و دفع مراد ہے جو معاشرتی زندگی میں افراد انسانی کے درمیان موجود ہے۔ انسانی معاشرے میں مشترکہ مفاد کی بنیاد پر باہمی تعاون کی چند صورتیں ہیں، وہ بھی ہماری بحث سے خارج ہیں۔

زیادہ تر دوستی و رفاقت یا دشمنی اور عداوت سب انسانی جذب و دفع کے مظاہر ہیں۔ یہ

---

[1] آج کل انسان کی جسمانی ساخت کو ایک مشین کی مانند سمجھا جاتا ہے اور دفع کے عمل کو نکاسی کی مانند۔

جذب ودفع مطابقت ومشابہت ی ضدیت ومنافرت کی بنیاد[1] پر ہیں۔ درحقیقت جذب ودفع کی بنیادی علت کومطابقت اور تضاد میں تلاش کرنا چاہے۔جیسا کہ فلسفیوں کی بحث میں مسلم ہے کہ

السنخیۃ علّۃ الانضمام
یعنی مطابقت یکجہتی کا سبب ہے۔

جذب ودفع کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان فرق

جاذبہ ودافعہ کے اعتبار سے لوگ یکساں نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف طبقات میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں:

١۔ وہ لوگ جو نہ جاذبہ رکھتے ہیں نہ دافعہ۔ نہ کوئی ان سے دوستی رکھتا ہے اور نہ ہی دشمنی۔ نہ عشق وتعلق اور محبت پیدا کرتے ہیں نہ عداوت وحسد اور کینہ ونفرت۔ وہ بے پرواہ ہوکر لوگوں کے درمیان چلتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک پتھر ہے جو لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے۔

یہ ایک مہمل اور بے اثر وجود ہے۔ وہ انسان جو فضیلت یا رذالت کے اعتبار سے کوئی مثبت نقطہ نہ رکھتا ہو (مثبت سے مراد یہاں صرف فضیلت کا پہلو نہیں ہے بلکہ شقاوت بھی مراد ہے) وہ ایک ایسا جانور ہے جو غذا کھاتا،سوتا اور انسانوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے۔ یہ اس گوسفند کی طرح ہے جو نہ کسی کا دوست ہے اور نہ کسی کا دشمن اور اگر لوگ اس کی خبر لیتے ہیں اور اسے پانی اور چارہ دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ کسی وقت اس کے گوشت سے فائدہ اٹھائیں۔

---

[1] اس کے برعکس جو برقی رو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر دو ہمنام اجسام (Positive) میں داخل کی جائے تو وہ ایک دوسرے سے دفع کرتی اور ناہمنام اجسام Positive Negetive میں داخل کی جائے تو ایک دوسرے کو جذب کرتی ہے۔

وہ نہ دوستانہ جذبات پیدا کر سکتا ہے نہ مخالفانہ۔ یہ ایک گروہ ہے جو بے قیمت اور بیہودہ و محروم لوگوں کا ہے۔ کیونکہ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوست رکھتا ہو اور لوگ اس کو دوست رکھتے ہوں۔ بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دشمن رکھتا ہو اور لوگ اسے دشمن رکھتے ہوں۔

۲۔ وہ لوگ جو جاذبہ تو رکھتے ہیں لیکن دافعہ نہیں رکھتے بلکہ ہر ایک کے لئے گرم جوشی رکھتے ہیں اور تمام طبقات کے تمام لوگوں کو اپنا مرید بناتے ہیں۔ زندگی میں سب لوگ انہیں دوست رکھتے ہیں اور کوئی ان کا انکار نہیں کرتا۔ جب مرتے ہیں تب بھی مسلمان ان کو آب زمزم سے غسل دیتے ہیں اور ہندو ان کے جسم کو جلاتے ہیں۔

چنان با نیک و بد خو کن کہ بعد از مردنت عرفی
مسلمانت بہ زمزم شوید و ہندو بسوزاند

عرفی! نیک و بد سب کے ساتھ اس طرح زندگی گزار کہ تیرے
مرنے کے بعد مسلمان تجھے زمزم سے غسل دیں اور ہندو جلا دیں.

اس شاعر کے اصول کے مطابق ایسے معاشرے میں جہاں آدھے لوگ مسلمان ہیں اور جنازے کا احترام کرتے ہیں اور اسے غسل دیتے ہیں اور کبھی زیادہ احترام کرتے ہوئے مقدس آب زمزم سے غسل دیتے ہیں، اور آدھے ہندو ہیں جو مردے کو جلاتے ہیں اور اس کی رکھ اڑا دیتے ہیں، اس طرح زندگی گزار کہ مسلمان تجھے اپنا سمجھیں اور مرنے کے بعد تجھے آب زمزم سے غسل دینا چاہیں اور ہندو بھی تجھے اپنا جانیں اور مرنے کے بعد تجھے جلا دینا چاہیں۔

غالباً لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حسن خلق، بہترین میل جول اور جدید اصطلاح میں سوشل ہونے کا مطلب یہی ہے کہ انسان سب کو دوست بنائے لیکن ایسا کرنا ایک ہدف اور مسلک رکھنے والے انسان کے لئے جو ذاتی مفاد کے بارے میں نہیں سوچتا بلکہ معاشرے میں ایک فکر اور نظریے کے لئے کام کرتا ہے، آسان نہیں ہے۔ ایسا انسان چار و ناچار یک رو، صاف گو

اور کٹر ہوتا ہے مگر یہ کہ وہ منافق اور دوغلا ہو۔ چونکہ تمام لوگ ایک طرح نہیں سوچتے، ایک طرح کا احساس نہیں رکھتے اور سب کی پسند ایک جیسی نہیں ہوتی لوگوں میں انصاف کرنے والے بھی ہیں اور ستم کرنے والے بھی۔ اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔

معاشرے میں انصاف پسند، ظلم کرنے والے، عادل اور فاسق سب لوگ ہیں۔ وہ سب کسی ایسے انسان کو دوست نہیں رکھ سکتے جو ایک ہدف کے لئے صحیح معنوں میں کام کرتا ہو اور خواہ مخواہ ان میں سے بعض کے مفاد سے متصادم ہو۔ مختلف طبقات اور مختلف نظریات کے لوگوں کو اپنی طرف جلب کرنے میں صرف وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جو ریاکار اور جھوٹا ہو اور ہر کسی سے اس کی پسند کے مطابق بات کرے اور ریا سے کام لے۔ لیکن اگر انسان یک رو اور پختہ عقیدہ رکھتا ہو تو قہری طور پر کچھ لوگ اس کے دوست ہوں گے اور کچھ لوگ اس کے دشمن بھی۔ وہ لوگ جن کی راہ اس سے ملتی ہے اس کی طرف کھچے چلے آئیں گے اور جو لوگ اس کی راہ کے مخالف جارہے ہیں وہ اسے اپنے سے دور پھینکیں گے اور اس کی مخالفت کریں گے۔

بعض مسیحی جو اپنے آپ اور اپنے وطیرے کو محبت کا پیامی سمجھتے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ انسان کامل فقط محبت رکھتا ہے اور بس۔ یوں صرف جاذبہ رکھتا ہے اور شاید بعض ہندو بھی اس طرح کا دعویٰ کرتے ہیں۔

مسیحی اور ہندی فلسفوں میں زیادہ نمایاں تعلیم محبت ہی نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر چیز سے تعلق رکھنا چاہیے اور محبت کا اظہار کرنا چاہیے اور جب ہم سب کو دوست رکھتے ہیں تو اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہوسکتی کہ وہ بھی ہمیں دوست رکھیں۔ برے بھی ہم کو دوست رکھیں گے کیونکہ انہوں نے ہم سے صرف محبت ہی دیکھی ہے۔

لیکن ان حضرات کو جان لینا چاہیے کہ صرف اہل محبت ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اہل مسلک (عقیدہ) ہونا بھی ضروری ہے اور کتاب بنام یہ ہے میرا مذہب میں گاندھی کے بقول محبت کو حقیقت کا جڑواں ہونا چاہئے اور حقیقت کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلک بھی

ہے اور مسلک خواہ مخواہ دشمن پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا واقعہ ہے جو بعض کے ساتھ مقابلہ کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور بعض کو رد کر دیتا ہے۔

اسلام بھی قانون محبت ہے۔ قرآن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہچان رحمۃ للعالمین کی حیثیت سے کراتا ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ. [1]

ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر عالمین کے لئے رحمت بنا کر۔

یعنی اپنے سخت ترین دشمنوں کے لئے بھی رحمت بنو اور ان سے بھی محبت کرو۔ [2] لیکن قرآن جس محبت کا حکم دیتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم ہر شخص کی پسند اور خواہش کے مطابق عمل کریں اور اس کے ساتھ اس طرح کا چلن اختیار کریں کہ وہ ہم سے خوش ہو اور نتیجتاً وہ ہماری طرف کشاں کشاں چلا آئے۔ محبت یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کو اس کی خواہشات میں آزاد چھوڑ دیں یا ان خواہشات کی تائید کریں۔ محبت وہ ہے جو حقیقت سے مربوط ہو۔ محبت خیر خواہی ہے اور خیر خواہی کرتے ہوئے غالباً ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسرے فریق کی محبت جلب نہ کی جا سکے۔

اس راہ میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان جن سے تعلق خاطر رکھتا ہے وہ چونکہ اس

---

[1] سورۂ انبیاء آیت نمبر ۱۰۷

[2] بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر چیز سے محبت کرتے تھے یہاں تک کہ حیوانات اور جمادات کے ساتھ بھی۔ اسی لیے ہم آپ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ آپ کے تمام ہتھیاروں اور روزمرہ زندگی میں استعمال کی چیزوں کے خاص نام تھے۔ آپ کے گھوڑوں، تلواروں اور عماموں کے خاص نام تھے۔ ایسا صرف اس لیے تھا کہ تمام موجودات سے آپ کو محبت تھی۔ گویا آپ ہر چیز کے تشخص کے قائل تھے۔ ان کے علاوہ تاریخ میں اس طرح کا رویہ کسی اور انسان کے بارے میں نہیں ملتا۔ یہ روش بتاتی ہے کہ درحقیقت آپ انسانی عشق و محبت کی مثال تھے۔ جب کہ آپ احد کے دامن سے گزرتے تو چمکتی آنکھوں اور محبت سے لبریز نگاہوں سے احد کو مخاطب کر کے کہتے: جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَ نحبه۔ یعنی یہ ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ آپ ایسے انسان تھے کہ پہاڑ اور پتھر بھی آپ کی محبت سے بہرہ مند تھے۔

محبت کو اپنی خواہشات کے خلاف پاتے ہیں، وہ قدر دانی کی بجائے دشمنی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ منطقی اور معقول محبت وہ ہے جس میں انسانی معاشرے کی بہتری اور مصلحت ہو، نہ کہ ایک خاص فرد یا گروہ کی۔ بسا اوقات افراد کے ساتھ خیر خواہی اور محبت کرنا معاشرے کے ساتھ سراسر بدخواہی اور دشمنی کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

بڑے بڑے مصلحین کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ انسانی معاشرے کی اصلاح کے لئے کوشش کرتے تھے اور اپنے لئے تکلیفوں کا راستہ ہموار کرتے تھے لیکن لوگوں کی طرف سے دشمنی اور تکلیف کے علاوہ کوئی صلہ نہیں پاتے تھے۔ پس ایسا ہرگز نہی ہے کہ محبت ہر جگہ جاذبہ رکھتی ہو بلکہ کبھی کبھار محبت اس قدر شدید دافعہ کا جلوہ بھی دکھاتی ہے کہ انسان کی مخالفت میں جماعتیں تشکیل کی جاتی ہیں۔

عبد الرحمن ابن ملجم مرادی، علی علیہ السلام کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھا۔علی علیہ السلام خوب جانتے تھے کہ یہ شخص ان کا ایک خطرناک دشمن ہے۔ دوسرے لوگ بھی کبھی کبھی کہتے تھے کہ یہ شخص خطرناک ہے، اس کی بیخ کنی کیجئے۔ مگر علی علیہ السلام کہتے:

کیا ہے میں جرم سے پہلے قصاص لوں؟ اگر وہ میرا قاتل ہے تو میں اپنے قاتل کو نہیں مار سکتا۔ وہ میرا قاتل ہے، نہ کہ میں اس کا قاتل۔

اور اسی کے بارے میں علی علیہ السلام نے کہا:

أُرِيدُ حَيَاتَهُ وَ يُرِيدُ قَتْلِي

عَذِيرَكَ مِنْ خَلِيلِكَ مِنْ مُرَاد.[1]

یعنی میں چاہتا ہوں وہ زندہ رہے اور اس کی سعادت چاہتا ہوں اور وہ چاہتا ہے کہ مجھے قتل کر دے۔ میں اس سے محبت و تعلق رکھتا ہوں لیکن وہ میرے ساتھ دشمنی اور کینہ رکھتا ہے۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ محبت ہی تنہا انسانی امراض کا علاج نہیں ہے بلکہ بعض طبقوں

---

[1] بحار الانوار جدید ایڈیشن۔ج ٤٢،ص ١٩٣۔١٩٦

اور مزاجوں کے لئے سختی کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور مقابلہ، دفع اور رد کر دینا لازم ہو جاتا ہے۔ اسلام جذب و محبت کا دین ہے۔ ساتھ ہی دفع اور غضب [1] کا دین بھی۔

جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے پر اس لئے ناراض ہوتا ہے کہ اس سے محبت ہے اور اس کے مستقبل کی فکر ہے۔ اگر کوئی غلط کام کرے تو ناخوش ہو جاتا ہے اور کبھی اسے مارتا بھی ہے۔ حالانکہ دوسروں کی اس سے زیادہ نامعقول روش دیکھتا ہے لیکن وہ محسوس نہیں کرتا۔ مگر چونکہ اپنے بچے سے تعلق خاطر رکھتا تھا اس لئے ناراض ہوا اور دوسروں کے بچوں سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے ناراض بھی نہیں ہوا۔

اور دوسری طرف تعلق خاطر کبھی غلط بھی ہوتا ہے۔ یعنی محض ایک جذبہ ہے جو حکم عقل کے تابع نہیں ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ (۲۴ نور: ۲) یعنی قانون الٰہی کے اجراء میں تمہاری محبت و نرمی مجرم کو ڈھیل نہ دے۔ کیونکہ اسلام جس طرح افراد کے ساتھ تعلق خاطر رکھتا ہے اسی طرح معاشرے کے ساتھ بھی تعلق خاطر رکھتا ہے۔ سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو انسان کی نظر میں چھوٹا ہو اور وہ اسے حقیر سمجھے امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

أَشَدُّ الذُّنُوبِ مَا اسْتَهَانَ بِهِ صَاحِبُه۔ [2]

سب سے شدید گناہ وہ ہے جسے گناہگار آسان اور ناچیز سمجھے گناہ کی اشاعت ہی وہ چیز ہے جس سے گناہ کی شدت نظروں سے کم ہو جاتی ہے اور فرد کی نظر میں اسے حقیر ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے اور وہ گناہ مکمل طور پر پردے میں نہ ہو اور لوگ اس سے باخبر ہو جائیں تو گناہ گار کو ہر صورت میں مورد سیاست قرار پانا چاہئے یا حد کی سزا

---

[1] ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نفرت بھی لطف و محبت کا ایک پہلو ہے۔ ہم دعا میں پڑھتے ہیں یا من سبقت رحمتہ غضبہ۔ اے وہ ذات جس کی رحمت نے اس کے غضب سے پہل کی اور چونکہ رحمت کرنا چاہتا تھا اس لیے غضب نازل کیا اور تو ناراض ہوا اور اگر محبت اور رحمت نہ ہوتی تو غضب بھی نہ ہوتا۔

[2] نہج البلاغہ حکمت: ۲۴۰

کھائے یا تعزیر کی۔ اسلامی فقہ میں کلی طور پر کہا گیا ہے کہ ہر واجب کے ترک اور ہر حرام کی بجا آوری پر اگر حد کا تعین نہ کیا گیا ہو تو اس کے لئے تعزیر ہے۔ تعزیر حد سے کمتر سزا ہے جس کا حاکم (شرع) اپنی صوابدید کے مطابق تعین کرتا ہے۔ ایک فرد کے گناہ اور اس کی اشاعت پر معاشرہ ایک قدم گناہ کے نزدیک ہوا اور یہ اس (معاشرہ) کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ پس گناہگار کو اس کے گناہ کی اہمیت کے مناسب سزا دی جانی چاہیے تاکہ معاشرہ اپنی راہ پر واپس آجائے اور گناہ کی شدت نظروں سے کم نہ ہو۔

اس بناء پر سزا اور عذاب ایک ایسی محبت ہے جو معاشرے کے لئے فراہم کی جاتی ہے۔

۳۔ وہ لوگ جو دافعہ رکھتے ہیں لیکن جاذبہ نہیں رکھتے۔ جو صرف دشمن بناتے ہیں لیکن دوست نہیں بناتے۔ یہ بھی ناقص لوگ ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں مثبت انسانی خصلتیں مفقود ہیں۔ کیونکہ اگر وہ انسانی خصائل کے حامل ہوتے تو ہر چند تھوڑی تعداد میں ہی سہی، ایک گروہ ایسا ضرور رکھتے جو ان کا طرفدار اور ان سے تعلق خاطر رکھنے والا ہو۔ کیونکہ لوگوں کے درمیان اچھے لوگ ہمیشہ موجود ہوتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد کم ہو، لیکن کبھی سب لوگ برے نہیں ہوتے۔ جس طرح کہ کسی زمانے میں بھی سارے لوگ اچھے نہیں ہوتے۔ اس لئے لازمی طور پر کسی سے اگر سب کو دشمنی ہو تو خرابی اس کی اپنی ہے۔ ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک انسان کی روح میں خوبیاں ہوں اور وہ کوئی دوست نہ رکھتا ہو۔ اس قسم کے لوگ اپنے وجود میں کوئی مثبت پہلو نہیں رکھتے حتیٰ کہ شقاوت کا پہلو بھی۔ ان کا وجود سراسر تلخ ہے اور سب کے لئے تلخ ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کم از کم بعض کے لئے شیریں ہو۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

أَعْجَزُ النَّاسِ مَنْ عَجَزَ عَنِ اكْتِسَابِ الْإِخْوَانِ وَ أَعْجَزُ مِنْهُ مَنْ ضَيَّعَ

مَنْ ظَفِرَ بِهِ مِنْهُمْ. [۱]

لوگوں میں درماندہ وہ ہے جو اپنی عمر میں کچھ بھائی اپنے لئے حاصل نہ کرسکے اور اس سے بھی زیادہ درماندہ وہ ہے جو پاکر اسے کھودے۔

٤۔لوگ جو جاذبہ بھی رکھتے ہیں اور دافعہ بھی۔ وہ باصول لوگ جو اپنے مسلک اور عقیدے کی راہ میں جدو جہد کرتے ہیں، چند گروہوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، دلوں میں محبوب اور مقصود کی حیثیت سے گھر کر جاتے ہیں اور چند گروہوں کو اپنے سے دفع اور رد بھی کرتے ہیں۔ دوست بھی بناتے ہیں اور دشمن بھی۔موافق پرور بھی ہیں اور مخالف پرور بھی۔

ان کی بھی چند قسمیں ہیں کیونکہ کبھی جاذبہ و دافعہ دونوں قومی ہیں، کبھی دونوں ضعیف اور کبھی ایک قوی اور دوسرا ضعیف۔ باوقار لوگ وہ ہیں جو جاذبہ و دافعہ ہر دو قوی رکھتے ہوں اور اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ان کی روح میں مثبت یا منفی (اقدار) کی بنیادیں کس قدر مضبوط ہیں۔البتہ قوت کے بھی مراتب ہیں، یہاں تک کہ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ مجذوب دوست اپنی جان فدا کر دیتے ہیں اور اس کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں اور دشمن بھی اس قدر سخت ہو جاتے ہیں کہ اس راہ (دشمنی) میں اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں اور یہ (صورت حال) اتنی قوی ہو جاتی ہے کہ ان کے مرنے کے بعد بھی صدیوں تک ان کے جذب و دفع (کی شدت) انسانی روحوں میں کارفرما ہوتی ہے اور ایک وسیع حلقے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور یہ سہ پہلو جذب و دفع صرف اولیاء کے لئے مختص ہے، جس طرح کہ سہ پہلو دعوت (مشن) پیغمبروں کے لئے مختص ہے۔ [۲]

دوسری جانب یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کن عناصر کو جذب اور کن عناصر کو دفع کرتے ہیں۔ مثلاً کبھی ایسا ہتا ہے کہ دانا عنصر کو جذب اور نادان عنصر کو دفع کرتے ہیں اور کبھی معاملہ اس کے

---

[۱] نہج البلاغہ حکمت: ۱۱

[۲] مقدمہ جلد اول خاتم پیامبران، ص ۱۱ و ۱۲

برعکس ہوتا ہے۔کبھی شریف اور نجیب عناصر کو جذب اور پلید اور خبیث عناصر کو دفع کرتے ہیں اور کبھی معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔لہذا دوست اور دشمن، جذب ہونے والے اور دور پھینکے جانے والے اس (جذب ودفع کرنے والے) کی ماہیت پر قطعی دلیلیں ہیں۔

کسی کی شخصیت کے قابل ستائش ہونے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ جاذبہ و دافعہ رکھتی ہے یا یہ کہ قوی جاذبہ ودافعہ رکھتی ہے، بلکہ یہ تو اصل شخصیت کی دلیل ہے اور کسی کی محض شخصیت کسی کی خوبی کی دلیل نہیں ہے۔دنیا کے تمام رہنما اور لیڈر حتیٰ کہ چنگیز خان، حجاج اور معاویہ جیسے جرائم پیشہ لوگ بھی جاذبہ اور دافعہ دونوں رکھتے تھے اور جب تک کسی کی روح میں مثبت نقطے موجود نہ ہوں، ممکن نہیں ہے کہ ہزاروں سپاہیوں کو وہ اپنا مطیع اور اپنے ارادے کا تابع بنالے۔جب تک رہنمائی کی طاقت نہ رکھتا ہو، آدمی اتنے لوگوں کو اپنے گرد جمع نہیں کرسکتا۔

نادر شاہ ایسے ہی افراد میں سے ایک ہے۔اس نے کتنے سر قلم کئے اور کتنی ہی آنکھیں حلقوں سے باہر نکال دیں لیکن اس کی شخصیت غیر معمولی طاقت کی حامل ہے۔اس نے صفوی عہد کے آخری دنوں میں شکست خوردہ اور لٹے پٹے ایران سے ایک بھاری لشکر تیار کیا اور میدان جنگ کو اس طرح اپنے گرد اکٹھا کیا جس طرح مقناطیس فولاد کے ذرّوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور یوں ایران کو نہ صرف غیروں کے تسلط سے نجات دلائی بلکہ ہندوستان کے آخری حصوں کو بھی فتح کرلیا اور نئی سرحدوں کو ایرانی سلطنت میں شامل کیا۔

بنابریں ہر شخصیت اپنے قبیل کے لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتی ہے اور اس کے مخالف لوگوں کو اپنے سے دور کردیتی ہے۔انصاف پرور اور شریف شخصیت نیکی پسند اور عدالت کے طلبگار عناصر کو اپنی طرف جذب کرتی ہے اور ہوس پرستوں، زر پرستوں اور منافقوں کو اپنے سے دور پھینکتی ہے۔جرائم پیشہ شخصیت مجرموں کو اپنے گرد جمع کرتی ہے اور نیک لوگوں کو اپنے سے دور پھینکتی ہے۔

اور جس طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، ایک دوسرا فرق قوت کشش (جذب) کی مقدار کا

ہے۔جس طرح کہ نیوٹن کے نظریہ کشش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی شئے کی جسامت اور کمتر فاصلے کی نسبت سے کشش اور جذب کی مقدار زیادہ ہوجاتی ہے۔انسانوں میں جذب کرنے والی شخصیت کے اعتبار سے جذب اور دباؤ (دفع) کی مقدار میں فرق پیدا ہوتا ہے۔

علی علیہ السلام دوہری قوت والی شخصیت

علی علیہ السلام ان لوگوں میں سے ہیں جو جاذبہ بھی رکھتے ہیں اور دافعہ بھی اور ان کا جاذبہ و دافعہ سخت قوی ہیں۔ شاید تمام صدیوں اور زمانوں میں علی علیہ السلام کے جاذبہ و دافعہ کی طرح کا قوی جاذبہ و دافعہ ہم پیدا نہ کر سکیں۔ وہ ایسے عجیب تاریخی، فداکار اور درگزر کرنے والے دوست رکھتے ہیں جو ان کے عشق میں آتش خرمن کے شعلوں کی طرح بھڑکتے اور دمکتے ہیں۔ وہ اس کی راہ میں جان دینے کو اپنی آرزو اور اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں اور جنہوں نے ان کی محبت میں ہر شئے کو بھلا دیا ہے۔ علی علیہ السلام کی موت کو سالہا سال بلکہ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن یہ جاذبہ و دافعہ اسی طرح اپنا جلوہ دکھا رہا ہے اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔

ان کی زندگی میں ایسے شریف و نجیب، خدا پرست، فداکار، بے لوث عناصر اور عفو و درگزر کرنے والے مہربان، عادل اور خدمت خلق کرنے والے لوگ ان کی ذات کے محور پر اس طرح گھومتے تھے کہ ان میں سے ہر ایک، ایک سبق آموز تاریخ رکھتا ہے اور ان کی موت کے بعد معاویہ و دیگر اموی خلفاء کے دور میں بے شمار لوگ ان کی دوستی کی پاداش میں سخت ترین شکنجوں میں کسے گئے، لیکن علی علیہ السلام کی دوستی اور عشق میں ان کے قدم نہ لڑکھڑائے اور آخری سانس تک وہ ثابت قدم رہے۔

دنیاوی شخصیتیں جب مرتی ہیں تو ان کے ساتھ ساری چیزیں مرجاتی ہیں اور ان کے جسم کے ساتھ زمین کے اندر پنہاں ہو جاتی ہیں۔ جبکہ حق والی شخصیتیں خود مرجاتی ہیں لیکن ان کا مکتب اور ان کے ساتھ لوگوں کا عشق صدیاں گزرنے کے باوجود تابندہ تر ہو جاتا ہے۔

ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ علی علیہ السلام کی موت کے سالہا سال بلکہ صدیوں بعد بھی لوگ دل وجان سے ان کے دشمنوں کے تیروں کو سینے سے لگاتے ہیں۔

علی علیہ السلام کے مجذوبین اور عاشقوں میں سے ایک میثم تمار کو ہم دیکھتے ہیں کہ مولیٰ کی شہادت کے بیس برس بعد بھی سولی پر علی علیہ السلام کے فضائل اور بلند انسانی اوصاف بیان کرتے ہیں۔ ان دنوں جبکہ تمام اسلامی دنیا گھٹن کا شکار ہے، تمام آزادیاں سلب ہیں، سانسیں سینوں میں بند ہیں، موت کا سا سکوت اس طرح طاری ہے جیسے چہروں پر موت کا غبار چھایا ہوا ہو، وہ تختۂ دار پر سے فریاد کرتا ہے کہ آجاؤ میں تمہیں علی علیہ السلام کے بارے میں بتادوں! لوگ میثم کی باتیں سننے کے لئے چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں۔

بنی امیہ اپنی آہنی حکومت اور اپنے مفاد کو خطرہ میں دیکھ کر حکم دیتی ہے کہ میثم کا منہ بند کر دیا جائے اور اس طرح انہوں نے چندروز میں میثم کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ تاریخ علی علیہ السلام کے بہت سے ایسے عاشقوں کا پتہ دیتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ جذبے باقی زمانوں کو چھوڑ کر صرف کسی ایک عصر سے مختص ہوں۔ ایسے طاقتور جذبوں کے جلوے ہم ہر دور میں دیکھتے ہیں کہ سخت مؤثر رہے ہیں۔

ابن سکّیت عربی ادب کے بڑے علماء میں سے ایک ہیں اور آج بھی عربی ادب کے ماہرین ان کو سیبویہ جیسے لوگوں کا ہم رتبہ سمجھتے ہیں۔ یہ عباسی خلیفہ متوکل کے دور کا آدمی ہے۔ یعنی علی علیہ السلام کی شہادت کے تقریباً دوسو سال بعد کا۔ متوکل کے دربار میں اس پر شیعہ ہونے کا الزام لگایا جاتا تھا۔ مگر چونکہ بہت ممتاز عالم تھا اس لئے متوکّل نے اسے اپنے بچوں کو پڑھانے کے لئے منتخب کیا۔ ایک دن جب متوکل کے بچے اس کے دربار میں آئے تو ابن سکّیت بھی ساتھ تھا۔ اس سے پہلے اسی دن ان کا امتحان بھی ہوا تھا جس میں انہوں نے اچھی کارکردگی دکھائی تھی۔ متوکل نے اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لئے یا پہلے سے اس کے ذہن میں جو بات ڈالی گئی تھی کہ اس کا میلان شیعیت کی طرف ہے، اس کی تصدیق کے لیے، ابن سکّیتسے پوچھا کہ یہ دو بچے تیرے

نزدیک زیادہ محبوب ہیں یا علی کے فرزند حسن اور حسین علیہم السلام؟

اس جملے اور اس موازنہ سے ابن سکیت سخت برہم ہوا۔اس کا خون کھولنے لگا اور اپنے آپ سے کہا کہ مغرور شخص کے کرتوت یہاں تک پہنچ گئے کہ اپنے بچوں کا حسن اور حسین علیہما السلام کے ساتھ موازنہ کرتا ہے۔ یہ میرا قصور ہے کہ ان کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کر رکھی ہے، اس نے متوکل کو جواب دیتے ہوئے کہا:

خدا کی قسم علی علیہ السلام کا غلام قنبر میرے نزدیک ان دونوں بچوں اور ان کے باپ سے زیادہ محبوب ہے۔

متوکل نے اسی جگہ حکم دیا کہ ابن سکیت کی زبان پشت گردن سے کھینچ لی جائے۔

تاریخ بہت سے ایسے دیوانوں کو جانتی ہے جنہوں نے اپنی جانوں کو بے اختیار علی علیہ السلام کی محبت کی راہ میں قربان کر دیا۔ یہ جاذبہ اور کہاں ملے گا؟ سوچا نہیں جا سکتا کہ دنیا میں اس کی کوئی اور نظیر ہو۔

علی علیہ السلام کے دشمن بھی اتنے ہی شدید ہیں۔ ایسے دشمن جو ان کے نام سے پیچ و تاب کھاتے ہیں۔علی علیہ السلام ایک فرد کی شکل میں اب دنیا میں نہیں، لیکن ایک مکتب کی صورت میں موجود ہیں اور اسی وجہ سے ایک گروہ کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور ایک گروہ کو اپنے سے دور پھینکتے ہیں۔

جی ہاں! علی علیہ السلام کی شخصیت میں دوہری طاقت ہے۔

جاذبۂ علی علیہ السلام کی قوت

طاقتور جاذبے

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی جلد کے مقدمہ میں تعلیمات کے بارے میں ہم یوں پڑھتے ہیں: انسانیت کے درمیان ظاہر ہونے والی تعلیمات ساری یکساں نہ تھیں اور یہ کہ ان کی تاثیر کا دائرہ بھی ایک جیسا نہیں تھا۔

بعض تعلیمات اور فکری نظاموں کا صرف ایک ہی پہلو ہے اور انکی پیشرفت ایک ہی جانب ہے۔ اپنے زمانے میں ایک وسیع سطح کو اپنی لپیٹ میں لیا، لاکھوں کی تعداد میں پیروکاروں کی جماعت پیدا کی، لیکن ان کا زمانہ ختم ہونے کے بعد ان کی بساط ہستی لپیٹ دی گئی اور وہ طاقِ نسیان میں ڈال دی گئیں۔

بعض تعلیمات اور فکری نظاموں کے دو پہلو ہیں، ان کی روشنی دو سمتوں میں آگے بڑھی جس نے ایک وسیع سطح کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ اسی طرح بعد کے زمانوں میں بھی پیش رفت کی یعنی صرف مکان کا ہی پہلو نہ تھا بلکہ زمان پر بھی وہ حاوی تھیں۔

اور بعض (تعلیمات اور فکری نظاموں) نے مختلف پہلوؤں سے پیش رفت کی ہے۔ وسیع سطح پر انسانی گروہوں کو لپیٹ میں لے کر اپنے زیر اثر کیا ہے۔ چنانچہ ہم دنیا کے ہر براعظم میں ان کا اثر ونفوذ دیکھتے ہیں اور زمان کا پہلو بھی۔ یعنی ایک عصر یا ایک زمانے سے مخصوص نہیں بلکہ صدیوں تک پورے اقتدار کے ساتھ ان کی حکمرانی رہی ہے۔ ان کی جڑیں انسانی روح کی گہرائیوں میں ہیں۔

انسانی ضمیر کے رازوں پر ان کا قبضہ ہے۔ قلب کی گہرائیوں پر ان کی حکمرانی ہے اور

احساس کی نبض پر ان کا ہاتھ ہے۔ یہ سہ پہلو تعلیمات سلسلۂ انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔

ایسا کون سا فکری یا فلسفی مکتب پیدا کیا جا سکتا ہے جس نے دنیا کے بڑے ادیان کی مانند، کروڑوں انسانوں پر تیس، بیس، یا کم از کم چودہ صدیاں حکومت کی ہو اور انسانی ضمیر کو جھنجھوڑا ہو؟!

جاذبے بھی اسی طرح ہیں۔ یعنی کبھی یک پہلو۔ کبھی دو پہلو اور کبھی سہ پہلو۔

علی علیہ السلام کا جاذبہ آخری قسم (سہ پہلو) سے ہے۔ انسانی جمعیت کی ایک وسیع سطح کو اپنا دیوانہ بھی بنایا اور یہ بھی کہ ایسا صرف ایک یا دو صدیوں کے لئے نہیں، وہ وقت کے ساتھ باقی رہا بلکہ اس میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو صدیوں اور عصروں سے درخشاں ہے اور اس طرح دل کی گہرائیوں اور باطن کو پنہائی میں پیوستہ ہے کہ صدیوں بعد بھی جب ان کو یاد کرتے ہیں اور ان کی اخلاقی بلندیوں کے بارے میں سنتے ہیں تو اشک شوق بہاتے ہیں اور ان کے مصائب پر گریہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ دشمن بھی متاثر ہو جاتے ہیں اور آنسو بہانے لگتے ہیں۔ یہ انتہائی طاقتور جاذبہ ہے۔

یہاں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دین کے ساتھ انسان کا رشتہ کمزور مادی رشتوں کی طرح نہیں ہے بلکہ ایک ایسا رشتہ ہے کہ انسانی روح کے ساتھ اس طرح کا کوئی دوسرا رشتہ نہیں۔ علی علیہ السلام اگر خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے اور مرد خدا نہ ہوتے تو فراموش ہو چکے ہوتے۔ انسانی تاریخ میں ایسے بہت سے سپتوں کا سراغ ملتا ہے۔ میدان خطابت کے سپوت، مردان علم و فلسفہ، قدرت و سلطنت کے داتا، میدان جنگ کے ہیرو، لیکن یا ان کو انسان نے بھلا دیا ہے یا سرے سے پہچانا ہی نہیں۔ مگر علی علیہ السلام نہ صرف یہ کہ قتل ہونے کے باوجود نہیں مرے بلکہ آپؑ زندہ تر ہو گئے۔ خود فرماتے ہیں:

هَلَكَ خُزَّانُ الْأَمْوَالِ وَ هُمْ أَحْيَاءٌ وَ الْعُلَمَاءُ بَاقُونَ مَا بَقِيَ الدَّهْرُ أَعْيَانُهُمْ مَفْقُودَةٌ وَ أَمْثَالُهُمْ فِي الْقُلُوبِ مَوْجُودَةٌ.[1]

---

[1] نہج البلاغہ حکمت: ۱۰

مال جمع کرنے والے زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہیں اور علماء باقی ہیں جب تک زمانہ باقی ہے۔ان کے جسم نظروں سے اوجھل ہیں لیکن ان کے آثار دلوں میں موجود ہیں۔

اپنی ذات کے بارے میں فرماتے ہیں:

غَداً تَرَوْنَ أَيَّامِي وَ يَكْشِفُ لَكُمْ عَنْ سَرَائِرِي وَ تَعْرِفُونَنِي بَعْدَ خُلُوِّ مَكَانِي وَ قِيَامِ غَيْرِي مَقَامِي.[1]

کل تم میرے ایام دیکھو گے اور میری وہ خصوصیات تمہارے او پر آشکار ہوجائیں گی جنہیں (آج) نہیں پہچانا گیا اور میری جگہ کے خالی ہونے اور میری جگہ پر میرے غیر کے بیٹھنے کے بعد تم مجھے پہچانو گے۔

عصرِ من ، دانندۂ اسرار نیست
یوسف من بہر این بازار نیست

میرا زمانہ اسرار کو جاننے والا نہیں میرا یوسف اس بازار کے لئے نہیں ہے

نامید استم ز یا ران قدیم
طور من سوزد کہ می آید کلیم

میں اپنے پرانے دوستوں سے مایوس ہوں میرا طور کلیم کے انتظار میں جل رہا ہے

قلزم یاران چو شبنم بی خروش
شبنم من مثل یمّ طوفان بہ دوش

دوستوں کا سمندر شبنم کی طرح خاموش ہے میری شبنم موجوں کی طرح طوفانی ہے

نغمۂ من از جہان دیگر است
این جرس را کاروان دیگر است

میرا نغمہ کسی اور ہی سے دنیا ہے یہ صدائے جرس کسی اور ہی کارواں کی ہے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ:۱٤۹

ای بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بربست و چشم ما گشاد

بہت سے شاعر مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں وہ اپنی آنکھوں بند کر کے ہماری آنکھیں کھولتے ہیں

رخت ناز از نیستی بیرون کشید
چون گل از خاک مزار خود دمید

ان کا حسن نیستی سے نکھرتا ہے اپنے مزار کی خاک سے پھولوں کی طرح کھلتے ہیں

درنمی گنجد بہ جو عمان من
بحرہا باید پی طوفان من

میرا عمان ندی میں نہیں سماتا میرے طوفان کو سمندروں کی ضرورت ہے

برقہا خوابیدہ درجان من است
کوہ و صحرا باب جولان من است

میرے دل میں بجلیاں سو رہی ہیں پہاڑ اور بیابان میری دوڑ کے لئے دروازے ہیں

چشمۂ حیوان کردہ اند
محرم راز حیاتم کردہ اند

انہوں نے مجھے آب حیات بخشا ہے انہوں نے مجھے زندگی کا راز سمجھا دیا ہے

ہیچ کس رازی کہ من گفتم نہ گفت
ہم چو فکر من در معنی نہ سفت

جو راز میں نے بتایا وہ کسی نے نہ بتایا میری فکر کی طرح کسی نے معنی کے موتی نہ پروئے

پیر گردون با من این اسرار گفت
از ندیمان راز ہا نتوان نہفت

بوڑھے آسمان نے مجھے یہ راز سمجھائے دوستوں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھی جاسکتی۔ [1]

درحقیقت علی علیہ السلام قوانین فطرت کی طرح ہیں جو جاودانی ہیں۔ وہ فیض کا ایسا سرچشمہ ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ دن بہ دن بڑھتا جاتا ہے اور بقول جبران خلیل جبران وہ ان شخصیتوں میں سے ہیں جو اپنے وقت سے پہلے ہی دنیا میں آگئیں۔

بعض لوگ صرف اپنے زمانے کے رہنما ہیں۔ بعض اپنے بعد بھی تھوڑے سے عرصے کے لئے رہنما ہیں اور رفتہ رفتہ ان کی رہنمائی یاد سے محو ہو جاتی ہے۔ لیکن علی علیہ السلام اور گنے چنے انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہادی اور رہنما ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

[1] کلیات اشعار فارسی علامہ اقبال ص ٦۔٧

تشیع؛ مکتب عشق ومحبت

تمام مذاہب میں مذہب شیعہ کو جو سب سے بڑا امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس کی اساس اور بنیاد محبت پر ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے، جب سے اس مذہب کی بنیاد پڑی ہے، یہ محبت اور دوستی کا سرچشمہ رہا ہے۔ جہاں ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے **علی و شیعته هم الفائزون** [1] علی علیہ السلام اوران کے شیعہ کامیاب ہیں سنتے ہیں وہاں ایک ایسے گروہ کوان کا گروہ دیکھتے ہیں کہ جوان کا عاشق، ان کے ساتھ گرم جوشی رکھنے والا اوران کا دیوانہ ہے۔ اس لحاظ سے تشیع عشق وشیفتگی کا مذہب ہے، ان حضرتؑ کے ساتھ تولا، عشق ومحبت کا مکتب ہے۔ محبت کے عنصر کو تشیع میں مکمل دخل ہے۔ تشیع کی تاریخ عاشقوں، شیدائیوں، جانبازوں اور دیوانوں کے ایک سلسلے کا دوسرا نام ہے۔

علی علیہ السلام وہ ہستی ہیں جو لوگوں پر خدائی حدود جاری کرتے، انہیں تازیانہ مارتے اور یقینی شرعی حد کے مطابق کسی کا ہاتھ کاٹتے لیکن اس کے باوجود لوگ ان سے منہ نہ پھیرتے اوران کی محبت میں کوئی کمی نہ آتی۔ آپؑ خود فرماتے ہیں:

---

[1] جلال الدین سیوطی درمنشور میں سورۂ مبینہ کی آیت ۷ کے ذیل میں ابن عساکر سے اور وہ جابر عبداللہ انصاری سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ہم پیغمبرؐ کے دربار میں حاضر تھے کہ علی علیہ السلام بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **والذی نفسی بیده ان هذا و شیعته هم الفائزون یوم القیمة** یعنی اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہ شخص اور اس کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب ہوں گے۔ مناوی کنوز الحقائق میں اسے دو روایتوں سے نقل کرتے ہیں اور ہیثمی مجمع الزوائد میں اور ابن حجر صواعق محرقہ میں اسی مضمون کو دوسرے طریقے سے نقل کرتے ہیں۔

لَوْ ضَرَبْتُ خَيْشُومَ الْمُؤْمِنِ بِسَيْفِي هَذَا عَلَى أَنْ يُبْغِضَنِي مَا أَبْغَضَنِي وَ لَوْ صَبَبْتُ الدُّنْيَا بِجَمَّاتِهَا عَلَى الْمُنَافِقِ عَلَى أَنْ يُحِبَّنِي مَا أَحَبَّنِي وَ ذَلِكَ أَنَّهُ قُضِيَ فَانْقَضَى عَلَى لِسَانِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أَنَّهُ قَالَ يَا عَلِيُّ لَا يُبْغِضُكَ مُؤْمِنٌ وَ لَا يُحِبُّكَ مُنَافِقٌ.[1]

اگر تو دیکھے کہ میں اپنی اس تلوار سے مومن کو ماروں کہ وہ میرا دشمن ہو جائے تب بھی وہ میرے ساتھ دشمنی نہیں کرے گا اور اگر ساری دنیا کسی منافق کو دے دوں کہ وہ مجھے دوست رکھے تب بھی ہرگز میرے ساتھ محبت نہیں کرے گا کیونکہ یہ بات گزر چکی اور پیغمبر امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر جاری ہو چکی ہے۔ فرمایا: اے علیؑ مومن تجھ سے دشمنی نہیں رکھے گا اور منافق دوستی نہیں رکھے گا۔

علی علیہ السلام فطرتوں اور طینتوں کی پرکھ کے لئے ایک معیار اور میزان ہیں۔ جس کی فطرت صحیح اور طینت پاکیزہ ہو وہ ان سے ناراض نہیں ہوتا خواہ ان کی شمشیر اس پر ٹوٹے اور جو آلودہ فطرت رکھتا ہے اسے ان سے محبت نہیں ہوتی اگرچہ وہ اس پر احسان بھی کریں کیونکہ وہ مجسم حقیقت کے علاوہ کچھ اور نہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام کے دوستداروں میں ایک شریف اور ایماندار شخص تھا بدقسمتی سے ایک لغزش اس سے سرزد ہوگئی اور اس پر حد جاری کرنا ضروری ہو گیا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے اس کا داہنا ہاتھ قطع کیا۔ اس نے اس (قطع شدہ ہاتھ) کو بائیں ہاتھ سے پکڑا۔ خون بہ رہا تھا اور وہ جا رہا تھا۔

ابن الکواء باغی خارجی نے اس موقعہ سے اپنے گروہ کے حق میں اور علی علیہ السلام کے خلاف فائدہ اٹھانا چاہا، ہمدردانہ قیافہ بنا کر نزدیک گیا اور کہا: تیرا ہاتھ کس نے قطع کیا؟

اس نے کہا:

قَطَعَ يَمِينِي سَيِّدُ الْوَصِيِّينَ وَ قَائِدُ الْغُرِّ الْمُحَجَّلِينَ وَ أَوْلَى النَّاسِ

---

[1] نہج البلاغۃ (للصبحی صالح)/ 477/ [43]45..... ص:477

بِالْمُؤْمِنِينَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ عليه السلام إِمَامُ الْهُدَى............... السَّابِقُ إِلَى جَنَّاتِ النَّعِيمِ مُصَادِمُ الْأَبْطَالِ الْمُنْتَقِمُ مِنَ الْجُهَّالِ مُعْطِي الزَّكَاةِ مَنِيعُ الصِّيَانَةِ مِنْ هَاشِمٍ الْقَمْقَامِ ابْنُ عَمِّ الرَّسُولِ الْهَادِي إِلَى الرَّشَادِ وَ النَّاطِقُ بِالسَّدَادِ شُجَاعٌ مَكِّيٌّ جَحْجَاحٌ وَفِيٌّ. [1]

میرا ہاتھ پیغمبروں کے جانشینوں کے سردار، قیامت کے دن سرخرو ہونے والوں کے پیشوا، مومنوں پر سب سے زیادہ حق رکھنے والے علی ابن ابی طالب علیہ السلام، ہدایت کے امام ....نعمت والی جنتوں کی طرف پہل کرنے والے، بہادروں کا مقابلہ کرنے والے، جاہلوں سے انتقام لینے والے، زکوٰۃ ادا کرنے والے، رشد و کمال کا راستہ دکھانے والے، سچ بات کہنے والے، مکہ کے شجاع اور بزرگوار وفا نے قطع کیا ہے۔

ابن الکواء نے کہا: افسوس ہے تجھ پر! اس نے تیرا ہاتھ قطع کیا اور تو اس کی اس طرح تعریفیں کرتا ہے؟

کہا: میں کیونکر اس کی تعریف نہ کروں۔ اس کی محبت میرے گوشت اور خون میں سرایت کر چکی ہے۔

خدا کی قسم! اس نے میرا ہاتھ قطع نہیں کیا ہے مگر یہ کہ خدا کے مقرر کردہ قانون کے تحت۔

اس قسم کے عشق اور اس طرح کی محبتیں جو علی علیہ السلام اور ان کے دوستوں کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں، ہمیں عشق و محبت کے مسئلہ اور اس کے آثار کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

---

[1] بحار الانوار ج۔۴۰، ص ۲۸۱۔۲۸۲، جدید ایڈیشن و تفسیر کبیر فخر رازی ذیل آیت ۹، سورۂ کہف ام حسبت ...

اکسیرِ محبت

فارسی زبان کے شعراء نے عشق کو اکسیر کا نام دیا ہے۔ کیمیا گروں کا اعتقاد تھا کہ دنیا میں ایک ایسا مادہ اکسیر [1] یا کیمیا کے نام سے موجود ہے جو ایک مادہ کو دوسرے مادہ میں تبدیل کر سکتا ہے۔ صدیوں وہ اس کے پیچھے پھرتے رہے۔ شعراء نے اس اصطلاح کو مستعار اور کہا ہے کہ حقیقت میں وہ اکسیر جو ایک مادہ کو دوسرے مادہ میں تبدیل کر سکتا ہے وہ عشق و محبت ہے۔ جو (کسی شئے کی) ماہیت کو تبدیل کر سکتا ہے۔ عشق مطلقاً اکسیر ہے اور اس میں کیمیا کی خاصیت ہے۔ یعنی ایک دھات کو دوسری دھات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ انسان بھی مختلف دھات ہیں:

---

[1] برہان قاطع میں اکسیر کے بارے میں کہا گیا ہے: ایک جوہر ہے جو پگھلانے، آمیزش اور کامل کرنے والا ہے یعنی تانبے کو سونا بناتا ہے اور فائدہ مند دواؤں اور مرشد کامل کی نظر کو بھی مجازاً اکسیر کہتے ہیں۔ اتفاق سے عشق میں بھی یہ تینوں خصوصیات موجود ہیں۔ پگھلانے والا بھی ہے، آمیزش بھی ہوتی ہے اور کامل کنندہ بھی ہے لیکن مشہور و معروف وجہ شبہ تیسری ہی ہے۔ یعنی مکمل بدل دینا اور اسی لیے شعراء نے کبھی عشق کو طبیب، دوا، افلاطون اور جالینوس بھی کہا ہے۔

مولانا روم مثنوی کے دیباچے میں کہتے ہیں:

شاد باش ای عشق خوش سودای ما

ای طبیب جملہ علتہای ما

ای دوای نخوت و ناموس ما

ای تو افلاطون و جالینوس ما

اے ہمارے عشق خوش سودا تو خوش رہ، اے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب

اے ہمارے فخر اور وقار کی دوا، اے ہمارے افلاطون اور جالینوس

النَّاسُ كَالْمَعْدَنِ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ .
انسان سونے اور چاندی کے معدن کی طرح ہیں۔
عشق ہی دل کو دل بنا تا ہے۔اگر عشق نہیں تو دل ہی نہیں آب وگل ہے۔

ہر آں دل را سوزی نیست دل نیست
دل افسردہ غیر از مشت گل نیست

جس دل میں درد نہیں وہ دل ہی نہیں، افسردہ دل مٹھی بھر مٹی کے علاوہ اور کچھ نہیں

الٰہی! سینۂ دہ آتش افروز
در آں سینہ دلی و ان دل ہمہ سوز

خدایا! ایک بھڑکتا ہوا سینہ دے، اوراس سینے میں سلگتا ہوا دل دے [1]

طاقت وقدرت عشق کی پیداوار ہیں۔محبت طاقت پیدا کرتی ہے اور بزدلوں کو بہادر بنا دیتی ہے۔ایک پالتو مرغی جب تک تنہا ہے اپنے بال و پر اپنی پشت پر جمع کر لیتی ہے۔آہستہ آہستہ چلتی ہے۔اپنی گردن موڑ کر کوئی ٹکڑا تلاش کرتی ہے تا کہ اسے کھائے۔ذرا سی آواز سن کر بھاگ جاتی ہے۔ایک کمزور بچے سے مقابلہ کرنے کی ہمت بھی اپنے اندر نہیں پاتی۔لیکن یہی مرغی جب چوزے نکالتی ہے اور عشق ومحبت اس کے پیکر وجود میں گھر کرتی ہے تو اس کی حالت ہی بدل جاتی ہے۔پشت پر جمع شدہ بال و پر دفاع کے لئے اپنی آمادگی کی علامت کے طور پر نیچے گرا دیتی ہے، اپنے اوپر جنگ کی سی حالت طاری کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اس کی آواز کا آہنگ بھی پہلے سے طاقت ور اور دلیرانہ ہو جاتا ہے۔پہلے کسی خطرے کے خیال سے ہی بھاگ جاتی تھی لیکن اب خطرے کے احتمال سے ہی حملہ کر دیتی ہے، دلیرانہ حملہ کرتی ہے۔یہ محبت اور عشق ہے جو ڈرپوک مرغی کو ایک دلیر جانور کا روپ دیتا ہے۔

عشق ومحبت کاہل اور سست کو چالاک اور ذہین بنا دیتی ہے حتیٰ کہ کاہل کو تیز فہم بنا دیتی

---

[1] وحشی کرمانی

ہے۔

وہ لڑکا اور لڑکی جو شادی سے پہلے کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچتے تھے سوائے ان چیزوں کے جو براہ راست ان کی اپنی ذات سے مربوط ہوں، وہی جونہی ایک دوسرے سے دل میں وابستگی پیدا ہوئی اور انہوں نے خاندان کا ادارہ تشکیل دیا، پہلی بار کسی اور کی قسمت کے بارے میں دلچسپی لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے اور جیسے ہی ان کے ہاں بچے نے جنم لیا ان کی فطرت بالکل بدل جاتی ہے۔ اب وہی سست اور کاہل لڑکا چالاک اور فعال ہو گیا ہے اور وہی لڑکی جو بزور بھی اپنے بستر سے نہیں جاگتی تھی اب اپنے گہوارہ نشین بچے کی آواز سنتے ہی بجلی کی طرح لپکتی ہے۔ وہ کون سی طاقت ہے جس نے سستی اور کاہلی کو ختم کیا اور اس جوان کو اس قدر حساس بنا دیا؟ وہ عشق و محبت کے علاوہ کچھ نہیں۔

عشق ہی ہے جو بخیل کو سخی اور کمزور اور بے صبرے کو متحمل (مزاج) اور صابر بناتا ہے۔ یہ عشق کا ہی اثر ہے کہ ایک خود غرض مرغی جو صرف اپنے لئے سوچتی تھی کہ کوئی دانہ جمع کرے اور اپنی حفاظت کرے، اب ایک سخی وجود بن گئی ہے کہ جب کوئی دانہ پیدا کیا اپنے چوزوں کو آواز دیتی ہے یا ایک ماں کو جو کل تک ایک بے نام صرف کھانے اور سونے والی زود رنج اور کمزور لڑکی تھی، بھوک، بے خوابی اور جسمانی تھکاوت کے مقابلے میں صبر اور تحمل کی عظیم قوت دی اور ممتا کی تمام زحمتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیا۔

روح کی سختی و تندخوئی ختم کر کے نرمی و رقت کا پیدا ہونا اور دوسرے لفظوں میں (دوسروں سے) مہربانی و نرم خوئی سے پیش آنا اور اسی طرح صلاحیتوں کے انتشار و افتراق کو ختم کرے انہیں یکجا کرنا اور اس یکجہتی کے نتیجے میں قدرت و طاقت کا حصول سب عشق و محبت کے آثار ہیں۔

شعر و ادب کی زبان میں عشق کے جس اثر کا بیشتر ذکر ہم دیکھتے ہیں وہ وجدان اور عشق کی فیاضی ہے۔

بلبل از فیض گل آموخت سخن ورنہ نہ
بود این ہمہ قول وغزل تعبیہ درمنقارش [1]

بلبل نے نغمہ سنجی گل کے فیض سے سیکھی ورنہ یہ فصاحت ونغمگی اس کی منقار میں نہ ہوتی۔

فیض گل اگرچہ ظاہری لفظ کے اعتبار سے بلبل کی ذات سے خارج ایک امر ہے لیکن درحقیقت خود عشق کی قوت کے علاوہ کچھ نہیں۔

تو مپندار کہ مجنون سرخود مجنون شد
از سمک تا بہ سما کشش لیلیٰ بود [2]

یہ خیال نہ کرنا کہ مجنوں خود بہ خود مجنون بن گیا بلکہ لیلیٰ کی کشش نے سمک (مچھلی) سے سماء (آسمان) تک پہنچایا

عشق خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار اور بند جکڑی ہوئی قوتوں کو آزاد کردیتا ہے جس طرح ایٹم کے پھٹنے پر ایٹمی توانائیاں آزاد ہوجاتی ہیں۔

عشق وجدان عطا کرتا اور ہیرو پیدا کرتا ہے۔ کتنے ہی شاعر، فلسفی اور ہنرمند ایک طاقت ور عشق ومحبت کی پیداوار ہیں۔

عشق روح کی تکمیل کرتا اور حیرت انگیز باطنی صلاحیتوں کو آشکار کرتا ہے۔ ادارک کی قوتوں کے نقطۂ نگاہ سے یہ وجدان عطا کرتا اور احساس کی قوتوں کے نقطۂ نظر سے ارادہ اور ہمت کو تقویت دیتا ہے اور جب یہ عروج کی طرف بڑھتا ہے تو کرامت اور معجزہ ظاہر کرنے لگتا ہے۔ روح کو بیماریوں اور آلودگیوں سے پاک کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عشق صفائی (باطن) کرنے والا ہے۔ خودغرضی سے پیدا ہونے والی پست صفات یا بخل، کنجوسی، بزدلی، کاہلی، تکبر و

---

[1] لسان الغیب حافظ

[2] علامہ طباطبائی

خود پسندی جیسے ٹھنڈے جذبات کو ختم کر دیتا ہے۔ آپس کی نفرتوں اور کینوں کو زائل کرتا ہے۔اگر چہ عشق میں محرومیت اور ناکامی کا بھی امکان ہے۔تب یہ مشکلات اور عداوتیں پیدا کرتا ہے۔

از محبت تلخہا شیرین شود
از محبت مسہا زرین شود[1]

محبت تلخیوں کو شیرینی میں بدل دیتی ہے۔محبت تانبے کو سونے میں بدلتی ہے۔

عشق کا اثر روح کے لئے اس کی آبادی اور شادابی ہے اور جسم کے لئے زوال اور خرابی ہے۔جسم کے لئے عشق ویرانی کا باعث اور چہرے کی زردی، جسم کی کمزوری، ہاضمے کی خرابی اور اعصاب کے لئے تناؤ کا موجب ہے۔شاید جسم کے لئے تمام آثار تخریبی ہوں، لیکن روح کے لئے ایسا نہیں ہے۔

پھر عشق کا موضوع کیا ہو؟ اور کس طرح ایک شخص اس سے فائدہ اٹھائے؟

اس کے اجتماعی آثار سے قطع نظر، روح اور فرد کے نقطۂ نظر سے یہ تکمیلی ہے کیونکہ یہ قوت، نرمی، صفا، یکجہتی اور ہمت پیدا کرتا ہے۔کمزوری، زبونی، کدورت، افتراق اور کاہلی کو ختم کر دیتا ہے۔آلودگیوں جنہیں قرآن دسَّ کا نام دیتا ہے، ختم کرتا، آمیزشوں کو زائل کرتا اور فریب کو خلوص سے بدل دیتا ہے۔

شاہ جان مرجسم را ویران کند
بعد ویرانش آبادان کند

دل کا بادشاہ جسم ویران کرتا ہے اور اس کے بعد اسے آباد کرتا ہے

ای خنک جانی کہ بھر عشق و حال
بذل کرد او خان و مان و ملک و مال

---

[1] مثنوی معنوی

نیک دل وہ ہے جو عشق اور خوشی کی خاطر اپنا گھر بار جائیداد اور مال صرف کرے

کرد ویران خانہ بہر گنج زر
و ز ہمان گنجش کند معمور تر

اس نے اپنا گھر خزانہ کے لئے ویران کیا اور اسے مزید زر سے بھر دیا

آب را ببرید و جو را پاک کرد
بعد ازاں در جو رواں کرد آب خورد

وہ پانی لے گیا اور نہر کو خالی کیا پھر پانی کو نہر میں جاری کر دیا اور پانی پیا

پوست را بشگافت پیکان را کشید
پوست تازہ بعد از آتش برومید

اس نے پوست کو شگافتہ کیا اور پیکان کھینچا اس کے بعد اس پر تازہ پوست اسے پہنچایا

کاملان کز سرّ تحقیق آ گھند
بی خود حیران و مست و والہ اند

کامل لوگ جو تحقیق کے راز کو جانتے ہیں وہ بے خود، حیران اور مست ہیں

نہ چنین حیران کن پشتش سوی اوست
بل چنان حیران کہ غرق و مست دوست [1]

اس طرح حیران نہ ہو کہ اس کی پشت تیری طرف ہو بلکہ اس طرح حیران کردہ محبوب کی محبت میں غرق ہو۔

---

[1] مثنوی معنوی

حصار شکنی

قطع نظر اس سے کہ اس کی نوعیت جنسی ہے، نسلی ہے یا انسانی، نیز قطع نظر اس سے کہ محبوب کس طرح کی صفات اور خصوصیات کا حامل ہے۔ دلیر اور بہادر ہے، ہنر مند ہے، عالم ہے، یا مخصوص اخلاق و آداب اور خوبیوں کا مالک ہے، عشق و محبت انسان کو خودی اور خود پرستی (کے خول) سے باہر نکالتی ہے۔ خود پرستی محدودیت اور حصار ہے۔ کسی دوسرے کے ساتھ عشق مطلقاً اس حصار کو توڑ دیتا ہے۔ جب تک انسان اپنی ذات کے خول سے باہر نہیں نکلتا وہ کمزور، ڈرپوک، چمک دمک نہیں ہوتی، جوش اور ولولہ نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت سرد اور خاموش ہوتا ہے۔ مگر جونہی انسان اپنی ذات کے خول سے باہر قدم رکھتا اور خودی کے حصار کو توڑ دیتا ہے، یہ ساری برائیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

ہر کرا جامہ زعشقی چاک شد
او ز حرص و عیب کلی پاک شد

جس کا جامہ کسی عشق میں چاک ہوا۔ وہ لالچ اور دیگر عیوب سے بالکل پاک ہوا۔

خود پرستی کے حصار کو توڑ دینے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان اپنی ذات کے ساتھ دلچسپی کو یکسر نظر ختم کر دے اور یوں خود پرستی سے آزاد ہو۔ یہ بات بے معنی ہے کہ کوئی انسان یہ کوشش کرے کہ اپنی ذات کو دوست نہ رکھے۔ اپنی ذات سے دلچسپی جسے حُبّ ذات سے تعبیر کیا جاتا ہے، کوئی بری چیز نہیں ہے کہ جسے ختم کرنا ضروری ہے۔ انسان کی اصلاح اور تکمیل اس طرح نہیں ہوتی کہ اس مفروضے پر کہ انسان کے وجود میں چند غیر ضروری امور ہیں اور یہ کہ ان غیر ضروری

اور مضر امور کو معدوم کر دیا جانا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی اصلاح اس کے وجود سے کسی شئے کو کم کرنے میں نہیں بلکہ اس (وجود) کی تکمیل اور اس میں اضافہ کرنے میں ہے۔ فطرت نے انسان پر جو ذمہ داری ڈالی ہے وہ خلقت کا تکامل اور اس میں اضافہ کرنا ہے، نہ کہ اس میں کمی کرنا۔

خود پرستی کا مقابلہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اپنی ذات کو محدودیت سے بچایا جائے۔ اس خود کو وسعت پانا چاہیے اور خود کے گرد جو حصار کھینچا گیا ہے اسے توڑ دیا جانا چاہئے جس کی وجہ سے اس سے مربوط شخص یا فرد کے علاوہ ہر چیز بیگانہ اور خود سے خارج نظر آتی ہے۔ شخصیت کو اس قدر وسعت پا جانا چاہئے کہ تمام انسانوں بلکہ پوری کائنات کا احاطہ کرے۔ پس خود پرستی سے مقابلہ کرنے کا مطلب اپنی ذات کی محدودیت کا مقابلہ کرنا ہے، کیونکہ خود پرستی افکار اور میلانات کو محدود کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ عشق، انسان کی دلچسپی اور اس کے میلانات کو اس کی ذات سے باہر لے جاتا، اس کے وجود کو وسعت بخشتا اور اس کے پیکر ہستی کو بدل دیتا ہے اور اسی لئے عشق و محبت ایک عظیم اخلاقی اور تربیتی عنصر ہے بشرطیکہ صحیح ہدایت ہو اور صحیح طریقے سے اس سے استفادہ کیا جائے۔

عشق؛تعمیر ہے یا تخریب

کسی شے یا شخص کی محبت جب شدت کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اس طرح کہ انسان کے وجود کو مسخر کر کے اس کے وجود پر اس کی مکمل حکمرانی ہو،تو اس کا نام عشق ہے۔عشق محبت اور جذبات کی انتہا ہے۔

لیکن یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ جسے یہ (عشق) نام دیا جاتا ہے اس کی صرف ایک قسم ہے۔اس کی مکمل طور پر دو مختلف قسمیں ہیں: ایک قسم وہ ہے جس کے نتائج کو اچھا کہا جائے لیکن اس (عشق) کی دوسری قسم کے نتائج مکمل تخریبی اور منفی ہیں۔

انسانی جذبات کی قسمیں اور مراتب ہیں۔ان میں سے ایک شہوت،خاص طور پر جنسی شہوت کی قسم ہے جو کئی اعتبار سے انسان اور تمام حیوانات میں مشترک ہے۔اس فرق کے ساتھ کہ انسان میں یہ جذبہ ایک خاص اور ناگفتہ علت کی بناء پر انتہائی شدت اختیار کرتا ہے اور اسی وجہ سے لوگ اس کا نا عشق رکھ لیتے ہیں اور حیوان میں (یہ جذبہ) اس طرح نہیں ہوتا لیکن بہر حال اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے یہ شہوت کے جوش،شدت اور طوفان کے علاوہ کچھ نہیں۔یہ (جذبہ) جنسی ذرائع سے پیدا ہوتا ہے اور وہیں ختم ہوتا ہے۔

اس میں افزائش اور کمی کا تعلق آلۂ تناسل کی طبعی کارکردگی اور قہراً سن جوانی سے ہے۔ ایک طرف عمر میں اضافے اور دوسری طرف رُجھ جانے اور طاقت میں کمی کے ساتھ یہ کم ہوتا اور بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔

اس جوان کو جو کسی حسین چہرے اور زلف پیمان کو دیکھتے ہی لرزنے اور کسی نرم و نازک

ہاتھ کے لمس سے ہی بل کھانے لگتا ہے، یہ جان لینا چاہیے کہ معاملہ مادی اور حیوانی اثر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔اس طرح کے عشق جلد آتے ہیں اور جلد جاتے ہیں۔ یہ قابل اعتماد ہے نہ قابل تعریف بلکہ خطرناک اور فضیلت کش ہے۔صرف وہی شخص فائدے میں رہتا ہے جو پاکدامنی اور تقویٰ کی مدد سے اس کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے۔یعنی یہ قوت بذات خود انسان کو کسی فضیلت کی طرف آمادہ نہیں کرتی لیکن اگر یہ آدمی کے وجود میں رخنہ ڈالے اور پاکدامنی اور تقویٰ کی قوت سے اس کی کشمکش ہو اور روح اس کے دباؤ کو برداشت کرتے ہوئے اس کے سامنے سپر نہ ڈالے تو روح کو قوت وکمال بخشتی ہے۔

انسان جذبات کی ایک دوسری قسم رکھتا ہے جو اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے شہوت سے مختلف ہے۔بہتر ہے کہ ہم اسے محبت (عاطفہ) یا قرآن کی تعبیر میں مؤدت اور رحمت کا نام دیں۔

انسان جب تک اپنی شہوتوں کے زیر اثر ہے وہ (گویا) اپنی ذات سے باہر نہیں نکلا ہے۔وہ اپنی پسند کی چیز یا شخص کو اپنے لئے طلب کرتا اور شدت سے چاہتا ہے۔اگر وہ معشوق اور محبوب کے بارے میں سوچتا ہے تو اس طرح سوچتا ہے کہ کس طرح اس کے وصال سے بہرہ مند ہو اور زیادہ سے زیادہ لطف اٹھائے۔صاف ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال انسان کی روح کی تکمیل،تربیت اور اسے پاکیزہ نہیں کرسکتی۔

لیکن جب انسان اپنے اعلیٰ انسانی عواطف کے زیر اثر قرار پاتا ہے تو محبوب ومعشوق اس کی نظر میں احترام وعظمت پیدا کرتا ہے اور وہ اس (محبوب ومعشوق) کی نیک بختی چاہتا ہے۔وہ محبوب کی خواہشات پر اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔اس طرح کے عواطف خلوص، راستی، فیاضی، نرم خوئی اور ایثار پیدا کرتے ہیں۔برخلاف پہلی قسم کے جس سے تندخوئی، درندگی اور جنایت ابھرتی ہیں۔بچے لئے ماں کی مہر ومحبت اسی قسم سے ہے۔اولیاء اور مردان خدا سے محبت، اسی طرح وطن سے محبت بھی اسی قسم سے ہے۔یہ جذبات کی وہ قسم ہے کہ

اگر انتہائے کمال کو پہنچ جائے تو وہ تمام اچھے نتائج جن کی ہم نے پہلے تشریح کی ہے، مرتب ہوتے ہیں اور یہی قسم ہے جو روح کو بلندی، انفرادیت اور عظمت عطا کرتی ہے۔ جبکہ پہلی قسم روح کو زبوں کرنے والی ہے اور عشق کی یہی قسم ہے جو پائیدار ہے اور وصال سے یہ اور تیز و تند ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس پہلی قسم ناپائیدار ہے اور وصال اس کا مدفن شمار ہوتا ہے۔

قرآن کریم میاں بیوی کے رابطہ کو مودت اور رحمت کے کلمات سے تعبیر [۱] کرتا ہے اور یہ بہت اہم نکتہ ہے اور ازدواجی زندگی میں حیوانی سطح سے بلند جو انسانی پہلو ہے اس کی طرف اشارہ ہے نیز اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف شہوت کا عنصر ہی ازدواجی طبعی زندگی سے مربوط نہیں ہے بلکہ اصلی رابطہ خلوص، سچائی اور دو روحوں کے درمیان اتحاد ہے۔ دوسرے لفظوں میں میاں بیوی کو یگانگت کے رشتے میں منسلک کرنے والی چیز محبت و مودت اور خلوص و سچائی ہے نہ کہ شہوت جو حیوانوں میں بھی ہے۔

مولوی [۲] اپنے خوبصورت انداز میں شہوت اور مودت میں فرق بیان کرتے ہوئے اُس (شہوت) کو حیوانی اور اس (مودت) کو انسانی قرار دیتا ہے۔ کہتا ہے:

خشم و شہوت وصف حیوانی بود
مہر و رقت وصف انسانی بود

غصّہ اور شہوت حیوانی صفات ہیں، محبت و مہربانی انسانی اوصاف ہیں

این چنین خاصیتی در آدمی است
مہر حیوان را کم است آن از کمی است

---

[۱] وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ (روم:۲۱)
اور یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے ازواج پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے مابین محبت اور مہربانی پیدا کی۔

[۲] مولانا رومی

ایسی خوبیاں انسان میں ہیں، حیوان میں محبت کی کمی ہے، اور یہ اس کا نقص ہے۔

مادیت کے فلسفے کا پرچار کرنے والے بھی انسان کی اس معنوی حالت سے انکار نہیں کر سکے ہیں جو کئی جہات سے غیر مادی (Metaphysical) پہلو رکھتی ہے اور انسان اور مافوق انسان کے مادی ہونے (کے فلسفے) سے سازگار نہیں ہے۔ برٹرینڈ رسل اپنی کتاب شادی اور اخلاق میں کہتا ہے:

ایسا کام جس کا واحد مقصد کمانا ہو مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے نتیجے کے لئے اس کام کو اختیار کرنا چاہیے کہ جس میں ایک فرد یا ایک مقصد یا غایت پر یقین پوشیدہ ہو۔ عشق کا مقصد بھی اگر محبوب کا وصال ہو تو وہ ہماری شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتا اور مکمل طور پر ایسے کام کی طرح ہے جو ہم پیسے کے لئے انجام دیتے ہیں۔ اس کمال تک پہنچنے کے لئے ہمیں چاہیے کہ محبوب کے وجود کو اپنے وجود کی طرح جانیں اور اس کے جذبات و احساسات کو اپنا سمجھیں۔

دوسرا نکتہ جس کا ذکر کرنا اور جس کی طرف توجہ دینا چاہیے یہ ہے کہ شہوانی عشق بھی ممکن ہے فائدہ مند واقع ہو اور ایسا اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ تقویٰ اور پاک دامنی کے ساتھ مربوط ہو۔ یعنی ایک طرف فراق و نارسائی اور دوسری طرف پاکیزگی و عفت کی وجہ سے روح پر جو سوز و گداز اور دباؤ اور سختی وارد ہوتی ہے اس کے مفید نتائج نکل سکتے ہیں۔ اسی سلسلے میں عرفاء کہتے ہی ں کہ عشق مجازی، عشق حقیقی یعنی ذات احدیت کے ساتھ عشق میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اسی سلسلے میں روایت کرتے ہیں:

من عشق و کتم و عف و مات مات شهیدا

جو عشق کرے اور اسے پوشیدہ رکھے اور پاک دامنی کی حالت میں مر جائے تو وہ شہید مرا ہے۔

لیکن اس نکتے کو فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ عشق کی یہ قسم ان تمام فوائد کے باوجود جو یقیناً مخصوص حالات میں حاصل ہوتے ہیں، قابل تعریف نہیں ہے اور بہت خطرناک ہے۔ اس

لحاظ سے یہ مصیبت کی مانند ہے جو اگر کسی پر آپڑے اور وہ صبر و رضا کی قوت سے اس کا مقابلہ کرے تو نفس کو پاک اور مکمل کرنے والی ہے، خام کو پختہ اور آلودہ کو صاف کرتی ہے۔ لیکن مصیبت قابل تعریف نہیں ہے۔ کوئی شخص اس تربیتی عنصر سے فائدہ اٹھانے کی خاطر اپنے لئے مصیبت پیدا کرے۔

رسل یہاں بھی ایک قیمتی بات کہتا ہے:

قوت (Energy) رکھنے والے شخص کے لئے مصیبت ایک گرانبہا محرک ہے۔ وہ شخص جو اپنے آپ کو مکمل طور پر خوش بخت سمجھتا ہے، وہ مزید خوش بختی کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتا۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ اس بات کا جواز ہو کہ ہم دوسروں کو اس لئے رنج پہنچائیں تا کہ وہ کسی مفید راہ میں طرف قدم بڑھائیں۔ کیونکہ عموماً اس کا نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے اور انسان کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اس طرح تو یہ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے آپ کو ان حادثات کے حوالے کر دیں جو ہمارے راستے میں پیش آتے ہیں۔ [1]

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات میں مصائب اور آزمائشوں کے نتائج اور فوائد کی طرف بہت اشارہ کیا گیا ہے اور خدا کے لطف کی علامت کے طور پر انہیں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کسی لحاظ سے بھی کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دی گئی ہے کہ اس بہانے سے اپنے لئے یا دوسروں کے لئے کوئی مصیبت پیدا کرے۔

اس کے علاوہ عشق اور مصیبت کے درمیان ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ عشق کسی اور عنصر کے مقابلہ میں زیادہ عقل کی ضد ہے۔ یہ جہاں بھی قدم رکھتا ہے عقل کو اس کی مسند حکومت سے معزول کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرفانی ادب میں عقل و عشق کو دو رقیب کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ فلسفیوں اور عرفاء کے درمیان رقابت کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔ فلسفی عقل کی قوت پر اور عرفاء عشق کی قوت پر تکیہ اور اعتماد کرتے ہیں۔ رقابت کے اس میدان میں عرفانی ادبیات میں

---

[1] شادی اور اخلاق، ص ۱۳۴

عقل کی پہچان محکوم و مغلوب کی حیثیت سے کرائی گئی ہے۔ سعدی کہتا ہے:

نیک خواہانم نصیحت می کند

خشت بردیا زدن بے حاصل است

شوق را برصبر قوت غالب است

عقل را بر عشق دعویٰ باطل است

میرے خیر خواہ نصیحت کرتے ہیں سمندر میں اینٹ پھینکنا (کسی شئے کی بنیاد رکھنا) بے نتیجہ ہے۔ صبر پر شوق غالب ہے عشق پر عقل کا دعویٰ باطل ہے۔

ایک دوسرا (شاعر) کہتا ہے:

قیاس کردم تدبیر عقل در رہ عشق

چو شبنمی است کہ بر بحرمی زند رقمی

میرا خیال ہے کہ عشق کی راہ میں عقل کی تدبیر ایسی ہے کہ شبنم سمندر (کی سطح) پر کچھ لکھنے کی کوشش کرے۔

ایک ایسی قدرت والی طاقت جو زمام اختیار (دوسروں کے ہاتھ سے) چھین لیتی ہے اور بقول مولوی یہ (عشق) آدمی کو ادھر سے ادھر کھینچ لے جاتا ہے جس طرح سخت طوفان تنکے کو اور رسل کے بقول ایک ایسی چیز جو انارکی کی طرف مائل ہے کس طرح ممکن ہے کہ اس کی سفارش کی جائے۔

بہرحال کبھی کبھار مفید نتائج کا حامل ہونا اور بات ہے اور قابل تجویز و سفارش ہونا دوسری بات۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض فقہاء کی طرف سے ان اسلامی فلاسفروں[1] پر جنہوں نے الٰہیات کے ضمن میں اس پر بحث کی ہے اور اس کے نتائج و فوائد کو بیان کیا ہے،

---

[1] بوعلی سینا۔ رسالۂ عشق اور صدر المتألہین سفر سوم اسفار

اعتراض اور تنقید صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس طبقہ (فقہائ) نے یہ خیال کیا ہے کہ حکماء کے اس دستہ کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ (عشق) قابل تجویز وسفارش بھی ہے حالانکہ ان کی نظر صرف ان مفید نتائج پر ہے جو تقویٰ اور پاک دامنی کی حالت میں برآمد ہو سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اسے قابل تجویز و سفارش سمجھتے ہوں۔ یعنی بعینہ مصائب اور آزمائشوں کی طرح۔

اولیاء سے محبت وارادت

جیسا کہ ہم نے کہا ہے عشق و محبت، عشق حیوانی جنسی اور حیوانی نسلی میں منحصر نہیں ہے بلکہ عشق وجاذبہ کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کی سطح بلند تر ہے اور اساسی طور پر مادہ اور مادیات کی حدود سے باہر ہے اور اس کا سرچشمہ بقائے نسل کے جذبے سے ماوراء ہے اور حقیقت میں انسان اور حیوان کے درمیان فصل ممیز ہے اور وہ عشق معنوی اور انسانی ہے۔ بلند انسانی فضائل، خوبیوں اور جمال حقیقت کے ساتھ عشق۔

عشقہای کز پی رنگی بود
عشق نہ بود عاقبت ننگی بود

کسی رنگ کے ساتھ عشق کرنا درحقیقت عشق نہیں، عاقبت کی رسوائی ہے

زانکہ عشق مردگان پایندہ نیست
چوں کہ مردہ سوی ما آیندہ نیست

مردوں کے ساتھ عشق پائدار نہیں کیونکہ مردہ پھر ہمارے پاس نہیں آتا

عشق زندہ در روان و دربصر
ہر دو می باشد ز غنچہ تازہ تر

جسم ونظر میں زندہ کا عشق دونوں کو غنچے سے زیادہ تر وتازہ رکھتا ہے

عشق آں زندہ گزین کز باقی است
و ز شراب جانفزایت ساقی است

اس زندہ سے عشق کرو جو ہمیشہ باقی ہے جو تجھے زندگی کی شراب پلانے والا ہے

عشق آن بگزین کہ جملہ انبیاء
یافتند از عشق او کار و کیا

اس سے عشق کرو کہ سب پیغمبروں نے اسکے عشق سے مقصد اور عظمت کو پالیا۔[1]

اور یہی عشق ہے جسے قرآن کی بہت سی آیات میں محبت، وُدّ یا مودت کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ان آیات کی چند قسمیں ہیں:

۱۔ وہ آیتیں جو مومنین کے وصف میں ہیں اور خدا یا مومنوں سے ان کی گہری دوستی و محبت کے بارے میں ہیں:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط [2]

وہ لوگ جو ایمان لا چکے ہیں خدا کی محبت میں سخت تر ہیں۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ قف ط. [3]

جو لوگ مہاجروں سے پہلے مسلمانوں کے گھر (مدینہ) میں مقیم اور ایمان (مسلمانوں کے روحانی اور معنوی گھر) میں رہے، ان مہاجروں سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف آئے اور جو کچھ انہیں ملا اس سے اپنے دلوں میں کوئی ملال نہیں پاتے اور دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود حاجت مند کیوں نہ ہوں۔

۲۔ وہ آیتیں جو خدا کی مومنوں سے محبت کے بارے میں ہیں:

---

[1] مثنوی معنوی

[2] ۲ بقرہ:۱٦٥

[3] ٥٩ حشر:۹

اِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ.[1]

خداتوبہ کرنے والوں اور پاکیزہ لوگوں سے محبت رکھتا ہے۔

وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ.[2]

خدانیکوکاروں سے محبت رکھتا ہے۔

اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ.[3]

خداتقویٰ رکھنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

وَاللهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ.[4]

خداپاکیزہ لوگوں کودوست رکھتا ہے۔

اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ.[5]

خداانصاف کرنے والوں کودوست رکھتا ہے۔

۳۔ وہ آیتیں جو دوطرفہ دوستیوں اور دوآتشہ محبتوں کے بارے میں ہیں۔ خدا کی مومنوں سے محبت، مومنوں کی خدا سے محبت اور مومنوں کی ایک دوسرے سے محبت:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط [6]

کہدو اگرتم خدا سے محبت رکھتے ہوتو میری پیروی کروتا کہ خداتم سے محبت کرے اور تمہارے لئےتمہارے گناہوں کوبخش دے۔

---

[1] ۲ بقرہ:۲۲۲

[2] ۳ آل عمران:۱٤۸ و۵ مائدہ:۱۳

[3] ۹ توبہ:٤ و۷

[4] ۹ توبہ:۱۰۸

[5] ٤۹ حجرات:۹۔٦۰ ممتحنہ:۸

[6] ۳ آل عمران:۳۱

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ [1]

خدا ایک ایسی قوم کو لائے گا جس کو (خدا) دوست رکھتا ہوگا اور وہ (قوم) اس (خدا) کو دوست رکھتی ہوگی۔

مومنین کی آپس میں محبت

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا. [2]

جولوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل بجالائے ہیں ان کے لئے رحمن عنقریب دلوں میں محبت پیدا کرے گا۔

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً. [3]

اس نے تمہارے درمیان محبت اور مہربانی پیدا کی۔

اور یہی وہ محبت اور تعلق ہے جسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے لئے طلب کیا۔ [4] اور خدا کے حکم سے پیغمبر ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے رشتہ داروں کے لئے طلب فرمایا۔ [5]

اور جس طرح کہ روایات سے پتہ چلتا ہے دین کی روح اور اس کا جوہر محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ برید عجلی کہتا ہے:

میں امام باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک مسافر، جو خراسان سے اس طویل مسافت کو پیدل طے کرکے آیا تھا، امامؑ کے حضور شرفیاب ہوا اس نے اپنے پیر جب جوتوں سے

---

[1] ۵ مائدہ:۴۵

[2] ۱۹ مریم:۹۶

[3] ۳۰ روم:۲۱

[4] ابراہیم:۳۷

[5] شوریٰ:۲۳

باہر نکالے، تو وہ شگافتہ ہو کر خراب ہو چکے تھے۔ اس نے کہا خدا کی قسم! مجھے وہاں سے سوائے اہل بیتؑ کی محبت کے اور کوئی چیز یہاں کھینچ نہ لائی امامؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر کوئی پتھر بھی ہم سے محبت کرتا ہو تو خدا اسے (قیامت کے دن) ہمارے ساتھ محشور فرمائے گا اور ہمارے قریب کر دے گا،

وَهَلِ الدِّينُ إِلَّا الْحُبُّ.[1]

(یعنی) کیا دین محبت کے علاوہ کچھ اور ہے؟

کسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا کہ ہم اپنے بچوں کے نام آپ اور آپؑ کے آباء کے ناموں پر رکھتے ہیں کیا ہمیں اس کام کا کوئی فائدہ ہے؟

حضرتؑ نے فرمایا:

کیوں نہیں خدا کی قسم

وَهَلِ الدِّينُ إِلَّا الْحُبُّ.

کیا دین محبت کے علاوہ کچھ اور ہے؟

اس کے بعد (اس کی تائید میں) آیۂ شریفہ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ[2] کی تلاوت فرمائی۔[3]

بنیادی طور پر محبت ہی ہے جو پیروی کراتی ہے۔ عاشق کی مجال نہیں ہے کہ وہ معشوق کی خواہش سے سرتابی کرے۔ ہم اس (صورت حال) کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایک جوان عاشق اپنی معشوقہ اور محبوبہ کے لئے ہر شئے سے دستبردار ہوتا ہے اور ہر چیز اس پر قربان کر دیتا ہے۔

---

[1] سفینۃ البحار، ج۱ص۲۰۱ مادہ حُبّ

[2] ۳ آل عمران:۳۱

[3] سفینۃ البحار، ج۱،ص۲۰۱ مادہ سما

خدا کی اطاعت اوراس کی پرستش اس محبت اور عشق کی نسبت سے ہے جو انسان خدا سے رکھتا ہے۔جس طرح کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

تَعْصِي الْاِلَهَ وَ أَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهُ
هَذَا مُحَالٌ فِي الْفِعَالِ بَدِيعٌ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقاً لَأَطَعْتَهُ
إِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيع

خدا کے حکم کی نافرمانی کرو اور پھر بھی اس کی محبت کا دم بھرو۔ میری جان کی قسم! یہ عجیب رویہ ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو یقیناً اس کی اطاعت کرتا۔ کیونکہ محبت کرنے والا محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے۔

معاشرے میں محبت کی قوت

اجتماعی نقطۂ نظر سے محبت کی قوت ایک عظیم اور موئثر قوت ہے۔ بہترین معاشرہ وہ ہے جو محبت کی قوت سے چلایا جائے۔ حاکم اور منتظم لوگوں سے اور لوگ حاکم اور منتظم سے محبت کرتے ہوں۔

حکمران کی محبت حکومت کی زندگی کے ثبات اور اس کی پائداری کا ایک عظیم عامل ہے اور جب تک محبت کا عنصر نہ ہو کوئی رہنما کسی معاشرے کی رہبری اور لوگوں کی قانونی نظم وضبط کے تحت تربیت نہیں کر سکتا یا بہت مشکل سے کر سکتا ہے، اگرچہ وہ اس معاشرے میں عدل ومساوات کو جاری وساری بھی کرے۔ لوگ صرف اس وقت تک قانون کی پابندی کرتے ہیں جب تک وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حکمران کو ان سے محبت ہے اور یہی محبت ہے جو لوگوں کو پیروی اور اطاعت پر آمادہ کرتی ہے۔ قرآن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتا ہے کہ تم لوگوں کے درمیان نفوذ حاصل کرنے اور معاشرے کو چلانے کے لئے ایک عظیم قوت رکھتے ہو:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ.[1]

آپ ان کے لئے نرم مزاج واقع ہوئے اور اگر آپ تندخو اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، پس ان سے درگزر کرو اور ان کے لئے طلب مغفرت کرو اور معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۵۹

یہاں پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوگوں کی رغبت کی وجہ اس مہر ومحبت کو قرار دیا گیا ہے جو لوگوں کی نسبت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عام فرماتے تھے۔ پھر یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ان کی بخشش کے لئے استغفار کی جائے اور ان کے ساتھ مشورہ کیا جائے۔ یہ سب محبت اور دوستی کی علامتیں ہیں۔ جس طرح کہ نرمی، برداشت اور تحمل سب محبت اور احسان کے پہلو ہیں۔

او بہ تیغ حل چندین خلق را
وا خرید از تیغ ، چندین حلق را

اسنے حلم کی تلوار سے اتنے لوگوں کو سدھارا جبکہ لوہے کی تلوار اتنے ہی گلے کاٹتی

تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر
بل ز صد لشکر، ظفر انگیز تر[1]

حلم کی تلوار لوہے کی تلوار سے زیادہ تیز ہے بلکہ سو لشکر سے زیادہ فتح کرنے والی ہے

اور پھر قرآن فرماتا ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ.[2]

اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتیں۔ آپ بدی کو بہترین طریقے سے دفع کریں تو آپ دیکھ لیں گے کہ آپ کے ساتھ جس کی عداوت تھی وہ گویا نہایت قریبی دوست بن گیا ہے

بہ بخش ای پسر کاد میزادہ مید
بہ احسان تو ان کرد، وحشی بہ قید

اے میرے بیٹے معاف کردے کہ آدمی کو احسان سے اور درندے کو جال سے شکار کیا جاسکتا ہے

---

[1] مثنوی معنوی

[2] ۴۱ فصلت: ۳۴

عدو را بہ الطاف گردن بہ بند   کہ نتوان

بریدن   بہ   تیغ   این   کمند[۱]

دشمن کو مہربانی کے ذریعے جھکا دے کہ یہ کمند تلوار سے نہیں کاٹی جاسکتی

امیر المومنین علیہ السلام مالک اشتر کو مصر کی گورنری پر مقرر کرنے کے بعد لوگوں کے ساتھ روش کے ضمن میں یوں ہدایت فرماتے ہیں:

وَ أَشْعِرْ قَلْبَكَ الرَّحْمَةَ لِلرَّعِيَّةِ وَ الْمَحَبَّةَ لَهُمْ وَ اللُّطْفَ بِهِمْ .... فَأَعْطِهِمْ مِنْ عَفْوِكَ وَ صَفْحِكَ مِثْلِ الَّذِي تُحِبُّ وَ تَرْضَى أَنْ يُعْطِيَكَ اللهُ مِنْ عَفْوِهِ وَ صَفْحِهِ.[۲]

اپنے دل میں لوگوں کے لئے محبت و ہمدردی اور مہربانی کا جذبہ بیدار کر...اپنے عفو و درگزر سے انہیں اس طرح فائدہ پہنچا جس طرح تو چاہتا ہے کہ خداوند عالم اپنے عفو و درگزر سے تجھے فائدہ پہنچائے۔

حکمران کے دل کو ملت کے ساتھ محبت و ہمدردی کا گھر ہونا چاہیے۔صرف طاقت اور زور کافی نہیں ہے۔طاقت اور زور کے ساتھ لوگوں کو بھیڑوں کی طرح ہنکانا تو ممکن ہے لیکن ان کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے ان سے کام لینا ممکن نہیں ہے۔نہ صرف یہ کہ قدرت و زور کافی نہیں ہے بلکہ انصاف کا اجراء بھی اگر روکھے طریقے سے ہو تو کافی نہیں ہے۔حکمران کا ایک مہربان باپ کی طرح دل سے لوگوں کو دوست رکھنا اور ان سے ہمدردی جتانا ضروری ہے۔یہ بھی ضروری ہے کہ وہ (حکمران) ایک جاذب اور دل موہ لینے والی شخصیت کا مالک ہو تا کہ لوگوں کی محبت، ہمت اور ان کی عظیم انسانی صلاحیتوں کو آگے بڑھا سکے اور ان سے اپنے ہدف کی خدمت کا کام لے سکے۔

---

[۱] سعدی، بوستان

[۲] نہج البلاغہ، نامہ ۵۳

تہذیب نفس کا بہترین وسیلہ

عشق و محبت کے باب میں گزشتہ مباحث صرف مقدمہ تھیں اور اب ہم آہستہ آہستہ نتیجے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہماری اہم ترین بحث... جو درحقیقت ہماری اصل بحث ہے، یہ ہے کہ اولیاء کے ساتھ عشق و محبت اور نیکوکاروں کے ساتھ دوستی رکھنا بذاتِ خود ہدف ہے یا تہذیب نفس، اصلاحِ اخلاق اور انسانی فضائل اور رفعتوں کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔

عشق حیوانی میں، عاشق کی تمام تر نظر اور توجہ معشوق کی صورت، اعضاء کے تناسب اور اس کی جلد کے رنگ اور رعنائی پر ہوتی ہے۔ یہ ایک کشش ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچتی اور مجذوب بناتی ہے۔لیکن اس کشش سے جی بھر جانے کے بعد یہ آگ پھر نہیں بھڑکتی، بلکہ سرد پڑ جاتی اور (بالآخر) بجھ جاتی ہے۔لیکن عشق انسانی، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، حیات اور زندگی ہے، اطاعت کرانے اور پیروکار بنانے والا اور یہ عشق ہے جو عاشق کو معشوق کے ہمرنگ بناتا ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ معشوق کا ایک جلوہ ہو اور اس (معشوق) کی روش کا ایک عکس ہو۔جس طرح کہ خواجہ نصیرالدین طوسی شرح اشارات بوعلی میں کہتے ہیں:

وَ النَّفْسَانِيُّ هُوَ الَّذِي يَكُونُ مبدؤه - مُشَاكَلَةِ
نَفْسِ العاشق لِنَفْسِ المعشوق فِي الْجَوْهَرِ - وَ يَكُونُ أَكْثَرَ
إعجابه بشمائل المعشوق - لِأَنَّهَا آثَارَ صادرة عَنْ نَفْسِهِ...
وَ هُوَ يَجْعَلُ النَّفْسِ لَيِّنَةٍ شفيقة ذَاتَ وَجَدَ وَ رِقَّةٍ -

مُنْقَطِعَةٍ عَنِ الشَّوَاغِلِ الدُّنْيَوِيَّةِ.[1]

روحانی عشق وہ ہے جس کی بنیاد عاشق اور معشوق کی ذات میں ہمرنگی پر ہو۔ عاشق کی زیادہ تر توجہ معشوق کی روش اور اس کے (دل) سے ظاہر ہونے والے تاثرات پر رہتی ہے۔ یہ وہ عشق ہے جو روح کو نرم، پر شوق اور سرشار بنا دیتا ہے۔ (یہ روح میں) ایسی رِقت پیدا کر دیتا ہے جو عاشق کو دنیوی آلودگیوں سے بیزار کر دیتی ہے۔

محبت مشابہت اور ہمرنگی کی طرف لے جاتی ہے اور اس کی طاقت چاہنے والے کے اپنے محبوب کے ہمرنگ ہونے کا سبب بنتی ہے۔ محبت ایک ایسے برقی تار کی مانند ہے جو محبوب کے وجود سے چاہنے والے کو متصل کر دیتا ہے اور محبوب کی صفات کو اس میں منتقل کر دیتا ہے اور یہی مقام ہے جہاں محبوب کا انتخاب بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے دوست تلاش کرنے اور دوست بنانے کے موضوع میں سخت اہتمام کیا ہے اور اس ضمن میں بہت سی آیات اور روایات وارد ہوئی ہیں۔ کیونکہ دوستی ہمرنگ بنانے والی، (محبوب کو) خوبصورت جتانے والی اور (اس کے عیوب سے) غافل کر دینے والی ہوتی ہے۔ جہاں (محبت) اپنا پرتو ڈالتی ہے (عاشق)

---

[1] شرح اشارات، ج ۳، ص ۳۸۳ طبع جدید

کو عیب ہنر اور خار، گل و یاسمن نظر آتا ہے۔[1]

---

[1] عشق کی چند خامیاں بھی ہیں۔ ان خامیوں میں سے ایک یہ ہے کہ عاشق، معشوق کے حسن میں اتنا غرق ہو جاتا ہے کہ اس کی خامیوں سے غافل ہو جاتا ہے۔

حب الشئی یعمی و یصم یعنی کسی شئے کی محبت (آدمی کو) اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔

و من عشق شیأ اعشی بصرہ و امرض قلبہ۔ (نہج البلاغہ)

یعنی جو کسی چیز سے عشق کرتا ہے تو اس کی آنکھیں ناقص ہو جاتی ہیں اور دل مریض ہوتا ہے۔

سعدی گلستان میں کہتا ہے: ہر شخص کو اپنی عقل کامل اور اپنا بچہ خوبصورت نظر آتا ہے۔،، اس منفی اثر سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی جو ہم نے متن میں پڑھی ہے کہ عشق کا نتیجہ ہوش و ادراک کا حساس ہو جانا ہے۔ ہوش کی حساسیت اس اعتبار سے ہے کہ (عشق) انسان کو کاہلی سے نکالتا اور امکان کو عمل تک پہنچا تا ہے۔ لیکن عشق کا منفی اثر یہ نہیں ہے کہ آدمی کو کاہل بنا تا ہے، بلکہ (یہ ہے کہ) آدمی کو غافل بنا دیتا ہے۔ کاہلی کا مسئلہ غفلت سے الگ ہے۔ اکثر اوقات کم عقل لوگ متوازن جذبات کے نتیجے میں کم غافل ہوتے ہیں۔ عشق، فہم کو تیز تر کرتا ہے لیکن توجہ کو یک جہت اور یکسو کر دیتا ہے اور اسی لئے متن میں کہا گیا ہے کہ عشق کی خاصیت یکسو کر دینا ہے اور یہی یکسوئی اور ارتکاز ہے جس کی وجہ سے خامی پیدا ہو جاتی ہے اور دوسرے امور کی طرف توجہ میں کمی آجاتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر، عشق نہ صرف عیب کو چھپا تا ہے بلکہ عیب کو حسن کا جلوہ بھی دیتا ہے۔ کیونکہ عشق کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ جہاں اس کا پرتو پڑ جائے اس جگہ کو خوبصورت بنا دے۔ حسن کے ایک ذرے کو آفتاب، بلکہ سیاہ کو سفید اور ظلمت کو نور کا جلوہ دیتا ہے اور بقول وحشی:

اگر در کاسۂ چشمم نشینی! بجز از خوبیٔ لیلیٰ نہ بینی

اگر تم میری آنکھوں میں بیٹھ جاؤ تو لیلیٰ کے حسن کے علاوہ اور کچھ نہ دیکھو گے

اور اس کی وجہ ظاہراً یہ ہے کہ عشق علم کی طرح نہیں ہے جو سو فیصد معلوم کے تابع ہو۔ عشق کا داخلی اور نفسیاتی پہلو اس کے خارجی اور ظاہری پہلو سے زیادہ (شدید) ہے یعنی عشق کا میزان حسن کے میزان کے تابع نہیں ہے بلکہ زیادہ تر عاشق کی استعداد اور اس کی صلاحیت کے میزان کے تابع ہے۔ درحقیقت عاشق ایسی صلاحیت اور مادے کا حامل اور راکھ کے اندر (پوشیدہ) ایسی آگ (آتش زیر خاکستر) ہے جو بہانہ اور موقعہ کی تلاش میں پھرے اور جوں ہی کوئی موقعہ ملے اور اتفاق ہاتھ آئے۔ (اگرچہ) ابھی اس اتفاق کا راز معلوم نہ ہوا، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ عشق کی کوئی دلیل نہیں ہوتی، وہ داخلی قوت اپنا اثر دکھانے لگتی ہے اور اپنی توانائی کے حساب سے (محبوب کے لیے) حسن بناتا (مقرر کرتا) ہے نہ کہ اس حساب سے جتنا محبوب کے اندر حُسن ہے۔ یہی بات ہے جسے ہم متن میں پڑھتے ہیں کہ عاشق کی نظر میں معشوق کا عیب، ہنر اور خار، گُل و یاسمن ہے۔

بعض آیات وروایات میں ناپاک اور آلودہ لوگوں کی ہم نشینی اور دوستی سے سخت منع کیا گیا ہے اور بعض آیات وروایات میں نیک دل لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

ابن عباس نے کہا کہ ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔

لوگوں نے پوچھا: بہترین ہم نشین کون ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ ذَكَّرَكُمْ بِاللهِ رُؤْيَتُهُ، وَ زَادَكُمْ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ، وَ ذَكَّرَكُمْ بِالْآخِرَةِ عَمَلُهُ۔[1]

وہ جس کا دیدار تمہیں خدا کی یاد دلائے، جس کی گفتار تمہارے علم میں اضافہ کرے اور جس کا کردار تمہیں آخرت اور قیامت کی یاد دلائے۔

انسان، نیکوکار اور پاک طینت لوگوں کی محبت کی اکسیر کا محتاج ہے کہ محبت کرے اور پاک طینت لوگوں کی محبت اسے اپنا ہمرنگ وہم شکل قرار دے۔

اصلاح اخلاق اور تہذیب نفس کے لئے مختلف طریقے تجویز کئے گئے ہیں اور گوناگوں مشرب (نظریات) پیدا ہو گئے ہیں۔ جن میں سے ایک سقراطی مشرب ہے۔ اس مشرب کے مطابق انسان کو چاہیے کہ اپنی اصلاح کے لئے عقل اور تدبیر کا راستہ اختیار کرے۔ انسان پہلے پاکیزگی کے فوائد اور پراگندہ اخلاق کے نقصانات پر مکمل یقین (ایمان) پیدا کرے، اس کے بعد عقل ومنطق کے سہارے ایک ایک مذموم صفت کو تلاش کرے۔ اس شخص کی طرح جو اپنی ناک کے بال ایک ایک کر کے اکھیڑتا ہے یا اس کسان کی طرح جو اپنے کھیت سے غیر ضروری گھاس ایک ایک کر کے نکالتا ہے یا اس شخص کی طرح جو اپنی گندم سے ریت اور مٹی صاف کرنا چاہتا ہے اور یوں اپنے خرمن وجود کو پاک کرے۔ اس طریقے کے مطابق آدمی کو صبر، دقت اور

[1] بحار الانوار جلد ۱۵، کتاب العشرہ ص ۵۱ طبع قدیم

سوچ سمجھ کر اخلاقی برائیوں کو تدریجاً زائل کرنا چاہئے اور یوں آلودگیوں سے اپنے وجود کا سونا پاک کرنا چاہئے اور شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقل کے لئے اس کام سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے۔

فلسفی چاہتے ہیں کہ منطق اور طریق کار (Methodology) کے زور سے اخلاق کی اصلاح کی جائے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں: عفت وقناعت لوگوں کے درمیان انسان کی عزت و وقار بڑھانے کا سبب ہیں اور حرص ولالچ ذلت اور پستی کا موجب ہیں یا وہ کہتے ہیں کہ علم قدرت اور طاقت کا موجب ہے۔ علم ایسا ہے علم ویسا ہے...خاتم ملکِ سلیمان است علم۔ علم ایک ایسا چراغ ہے انسان کی راہ میں کہ جو راہ کو چاہ (کنویں) سے روشن کر دیتا ہے اور یا وہ کہتے ہیں کہ حسد اور بدخواہی روحانی بیماریاں ہیں۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے ان کے برے نتائج نکلتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

شک نہیں ہے کہ یہ راستہ صحیح راستہ ہے اور یہ ایک اچھا ذریعہ ہے۔ لیکن سوال کسی دوسرے ذریعے کے مقابلے میں اس ذریعے کی قدر و قیمت کا ہے۔ مثلاً جس طرح ایک گاڑی اچھا ذریعہ ہے لیکن اسے ہوائی جہاز کے مقابلے میں دیکھنا چاہیے کہ اس وسیلے کی قدر و قیمت کیا ہے۔

ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ رہنمائی کے نقطۂ نظر سے عقل کی قدر و قیمت کیا ہے یعنی اس نقطۂ نظر سے کہ اخلاقی مسائل کی واقعیت میں، عقلی اصطلاح میں استدلال (منطق) کس حد تک صحیح اور مطابق ہے اور یہ کہ (کس حد تک) خطا اور اشتباہ نہیں ہے۔ ہم اس قدر کہتے ہیں کہ اخلاقی اور اصلاحی فلسفے کے بے حد و بے شمار مکاتبِ فکر ہیں اور منطقی نقطۂ نگاہ سے یہ مسائل ابھی بحث اور اختلاف کی حد سے آگے نہیں بڑھے ہیں اور یہ پھر بھی ہم جانتے ہیں کہ اہل عرفان کلی طور پر کہتے ہیں:

پای استدلالیان چوبین بود   پای چوبین سخت بی تمکین بود

منطقیوں کے پاؤں لکڑی کے ہیں اور لکڑی کے پاؤں سخت بے اعتبار ہوتے ہیں۔

ہماری بحث فعلاً اس پہلو سے نہیں ہے بلکہ اس میں ہے کہ ان وسائل کے نتیجے کا وزن کیا ہے؟

اہل عرفان اور ارباب سیر وسلوک عقل و منطق کی بجائے محبت و ارادت کا راستہ اختیار کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ایک انسان کامل کو تلاش کرو اور اس کی محبت و عقیدت کو دل کی گہرائیوں میں بٹھالو کہ یہ عقل و منطق کی راہ کے مقابلے میں زیادہ بے خطر ہے اور سریع تر بھی۔ موازنے کے مقام پر دو ذریعے قدیم دستی اور جدید مشینی اوزار کی مانند ہیں۔ دل سے اخلاقی برائیوں کو زائل کرنے میں محبت و عقیدت کی تاثیر ویسی ہے، جس طرح دھات پر کیمیائی مواد کا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک نقاش حروف کے کناروں کو تیزاب کے سہارے دور کرتا ہے۔ ناخن، چاقو کی نوک یا اس طرح کی کسی اور چیز سے نہیں۔ لیکن اخلاقی برائیوں کی اصلاح کے لئے عقل کی قوت کا اثر بالکل اس طرح ہے کہ ایک شخص فولاد کے ریزے، مٹی میں سے اپنے ہاتھوں سے الگ کرنا چاہتا ہو۔ یہ کس قدر تکلیف اور زحمت کا کام ہے؟ اگر اس کے ہاتھ میں ایک طاقتور مقناطیس ہو تو ممکن ہے کہ ایک ہی گردش میں وہ ان تمام ریزوں کو الگ کر لے۔ محبت و عقیدت کی قوت مقناطیس کی طرح تمام صفات رذیلہ کو یکجا کر کے دور پھینک دیتی ہے۔ اہل عرفان کے عقیدے میں پاک طینت اور کامل لوگوں کی محبت و عقیدت ایک خود کار آلے کی طرح خود بہ خود برائیوں کو یکجا کرتی اور پھر باہر گرا دیتی ہے۔ مجذوبیت کی حالت اگر اس مقام تک پہنچ جائے تو یہ بہترین حالت ہے اور یہی ہے جو روح کو صاف کرتی اور عظمت بخشتی ہے۔

جی ہاں! جو اس راہ پر چلے ہیں وہ محبت کی قوت سے اخلاق کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں اور وہ عشق و ارادت کی قدرت پر بھروسہ کرتے ہیں۔ تجربہ نشاندہی کرتا ہے کہ روح پر جتنا اثر نیک طینت لوگوں کی صحبت اور ان کی عقیدت و محبت سے پڑتا ہے اتنا اثر اخلاقیات کی سینکڑوں کتابیں پڑھ کر بھی نہیں ہوسکتا۔ مولوی نے محبت کے پیغام کو نالہ نے (بانسری کی آواز) سے تعبیر کیا ہے وہ کہتا ہے:

ہمچونی زہری و تریاقی کہ دید؟

ہمچونی دمساز و مشتاقی کہ دید؟

نے کی طرح کس نے زہراور تریاق کو چکھا؟ نے کی طرح کون دمساز اور مشتاق ہے؟

ہر کرا جامہ زعشقی چاک شد

او ز حرص و عیب کلی پاک شد

جس کا جامہ کسی عشق میں چاک ہوا۔ وہ لالچ اور دیگر عیوب سے بالکل پاک ہوا۔

شادباش ای عشق خوش سودۂ ما

ای طبیب جملہ علّتہائی ما[1]

اے ہمارے عشق خوش سوداتو خوش رہ، اے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب

کبھی ہم ایسے بزرگوں کو دیکھتے ہیں جن کے عقیدت مندان کے راستہ چلنے، لباس پہننے، رویئے اور طرز گفتگو تک میں ان کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ اختیاری تقلید نہیں بلکہ خودبخود اور فطری ہے۔ محبت وعقیدت کی قوت ہے جو عاشق کی تمام رگ و پے میں سرایت کرجاتی ہے اور ہر لحاظ سے اسے محبوب کا ہمرنگ بنادیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی اصلاح کے لئے کسی مردحق کے پیچھے پھرنا اور اس سے عشق کرنا چاہیے تاکہ صحیح معنوں میں اپنی اصلاح کرسکے۔

گر در سرت ہوای وصال است حافظا

باید کہ خاک در گہِ اہل ہُنر شوی

حافظ اگر تجھے وصال (محبوب حقیقی) کی تمنا ہے تو کسی اہل ہنر کی درگاہ کی خاک بننا چاہیے۔

عشق سے پہلے کوئی شخص عبادت یا اچھا عمل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر بھی سستی اس کے ارکان ہمت میں راستہ پا جاتی ہے لیکن جب محبت وارادت اس کے وجود میں آ گئی تو وہ سستی

---

[1] مثنوی معنوی

اور آرام طلبی رخصت ہو جاتی ہے اور اس کا ارادہ پختہ اور ہمت بلند ہو جاتی ہے۔

مہر خوباں دل و دین از ہمہ بی پروا برد
رخ شطرنج نبرد آنچہ رخ زیبا برد

محبوب کی محبت نے دل اور دین سب سے بے پرواہ کر دیا۔ شطرنج نے نہیں بلکہ خوبصورت چہرہ یہ چیزیں لے اڑا۔

تو مپندار کہ مجنون سرِ خود مجنون شد
از سمک تا بہ سماکش کشش لیلیٰ برد

یہ خیال نہ کرنا کہ مجنوں خود بہ خود مجنون بن گیا بلکہ لیلیٰ کی کشش نے سمک (مچھلی) سے سماء (آسمان) تک پہنچایا۔

من بہ سرچشمۂ خورشید نہ خود بردم راہ
ذرّۂ ای بودم و عشق تو مرا بالا برد

میں خود سے آسمان پہ نہیں پہنچا ہوں۔ میں تو ایک ذرہ تھا لیکن تیرے عشق نے مجھے اونچا کیا۔

خم ابروی تو بود و کف مینوی تو بود
کہ درین بزم بگردید و دل شیدا برد[1]

یہ تیرے ابرو کا خم اور تیرا نرم ہاتھ ہی تو ہے جو اس محفل میں آیا اور دل لے گیا۔

تاریخ ایسے بزرگوں کا پتہ دیتی ہے کہ کامل لوگوں کے ساتھ عشق وعقیدت نے، کم از کم عقید تمندوں کے خیال میں، ان کے جسم وجان میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ مولانا رومی بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ ابتداء میں وہ اس قدر پرسوز اور پرجوش نہیں تھے۔ ایک عالم تھے لیکن سردمہری اور خاموشی کے ساتھ اپنے شہر کے ایک گوشے میں تدریس میں مشغول تھے۔ جس دن

---

[1] علاّمہ طباطبائی

شمس تبریزی سے واسطہ پڑااوران کی عقیدت نے دل وجان میں جگہ بنائی،ان کودگرگوں کردیا۔ ان کے وجود میں ایک آگ بھڑک اٹھی، گویا ایک گولہ تھا جو بارود کے ذخیرے پر جا پڑااور شعلے بھڑکنے لگے۔وہ خوداشعری مسلک رکھنے والے ایک شخص ہیں لیکن ان کی مثنوی بے شک دنیا کی بزرگ ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔اس کے تمام اشعار ایک طوفان اور ایک تحریک ہیں۔ انہوں نے دیوان شمس اپنے محبوب کی یاد میں لکھا ہے۔مثنوی میں بھی کثرت سے انہیں یاد کرتے ہیں۔مثنوی مولانا رومی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مطلب بیان کرتے کرتے جونہی شمس کی یاد آتی ہے تو ان کی روح میں ایک سخت طوفان اٹھتا ہے اور ان کے وجود میں طوفانی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔وہ کہتے ہیں:

این نفس جان دامنسم برتافتہ است

بوی پیراہان یوسف یافتہ است

اس جان نے میری روح کوجلاڈالا ہے(جس طرح)اس نے پیرہن یوسف کی خوشبو پائی ہے

کز برائی حق صحبت سالہا

باز گو رمزی ازان خوش حالہا

سالہاسال کی صحبت کی خاطران خوش کن لمحات کا راز دھرادے

تا زمین و آسمان خندان شود

عقل و روح و دیدہ صد چندان شود

تا کہ زمین اورآسمان خوش ہوجائے۔عقل،روح اورآنکھیں سوگنا بڑھ جائیں

گفتم ای دور اوفتادہ از حبیب

ہمچو بیماری کہ دور است از طبیب

میں نے کہااے وہ جودوست سے دور ہے۔اس بیمار کی طرح جوطبیب سے دور ہے۔

من چہ گویم یک رگم ہشیار نیست
شرح آن یاری کہ او را یار نیست

میں کیا کہوں میری کوئی رگ ہوش میں نہیں ہے۔اس دوست کی باتیں جو اپنے دوست کو کھو چکا ہے۔

شرح این ہجران و این خون جگر
این زمان بگذار تا وقت دگر

اس فراق اور اس خون جگر کی باتیں۔اس وقت بھول جا کسی اور وقت تک۔

فتنہ و آشوب و خونریزی مجو
بیش ازین از شمس تبریزی مگو[۱]

فتنہ، مصیبت اور خونریزی مت چاہو۔اس سے زیادہ شمس تبریزی کے بارے میں مت بولو۔

اور یہ (صورت حال) حافظ کے اس قول کا مکمل مصداق ہے:

بلبل از فیض گل آموخت سخن ورنہ نبود
این ہمہ قول و غزل تعبیہ در منقارش[۲]

بلبل نے نغمہ سنجی گل کے فیض سے سیکھی ورنہ یہ فصاحت و نغمگی اس کی منقار میں نہ ہوتی۔

یہاں سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کوشش اور کشش یا فعّالیت اور انجذاب کو ساتھ ساتھ ہونا چاہیے، جذبے کے بغیر کوشش سے کوئی کام نہیں بنتا۔جس طرح کوشش کے بغیر صرف کشش کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

---

[۱] مثنوی معنوی

[۲] لسان الغیب حافظ

تاریخ اسلام سے مثالیں

تاریخ اسلام میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے ساتھ مسلمانوں کی شدید محبت اور شیدائی کی واضح اور بے نظیر مثالیں ہم دیکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر انبیاءؑ اور فلسفیوں کے مکتب کے درمیان فرق یہی ہے کہ فلسفیوں کے شاگرد صرف متعلم ہیں اور فلسفی ایک معلم سے بڑھ کر کوئی نفوذ نہیں رکھتے۔ لیکن انبیاءؑ کا نفوذ ایک محبوب کے نفوذ کی قبیل سے ہے۔ ایسا محبوب جس نے محب کی روح کی گہرائیوں تک راہ پائی اور اس پر قبضہ کر رکھا ہے اور اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کی گرفت ہے۔

پہلی مثال

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عاشقوں میں سے ایک ابوذر غفاری ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک (مدینہ کے شمال میں سو فرسخ اور شام کی سرحدوں کے قریب) کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ بعض لوگوں نے حیلہ تراشی کی اور منافقین کام خراب کرنے لگے۔ (مسلمان) فوجی ساز و سامان سے خالی اور راشن کی ایسی تنگی اور قحط کا بھی شکار ہیں کہ کبھی کئی آدمی ایک خرما پر گزارہ کرتے تھے، لیکن سب خوش اور زندہ دل ہیں۔ عشق نے انہیں طاقتور بنا رکھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جذبے نے انہیں قدرت عطا کر رکھی ہے۔ ابوذر نے بھی اس لشکر کے ساتھ تبوک کی جانب کوچ کیا ہے۔ راستے میں سے تین آدمی یکے بعد دیگرے واپس چلے گئے۔ جو بھی واپس چلا جاتا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی اطلاع دی جاتی اور ہر بار پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے:

اگر اس میں کوئی نیکی ہے تو خدا اسے واپس بھیجے گا اور اگر اس میں کوئی نیکی نہیں ہے تو اچھا ہوا چلا گیا۔

ابوذر ؓ کا کمزور اور لاغر اونٹ مزید چل نہ سکا۔

لوگوں نے دیکھا کہ ابوذر بھی پیچھے رہ گیا ہے۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ابوذر بھی چلا گیا۔

آپ ؐ نے پھر وہی جملہ دہرایا:

اگر اس میں کوئی نیکی ہے تو خدا اسے واپس بھیجے گا اور اگر اس میں کوئی نیکی نہیں ہے تو اچھا ہوا چلا گیا۔

فوج اپنا راستہ چلتی رہی اور ابوذر پیچھے رہ گیا تھا، لیکن بغاوت نہیں بلکہ اس کا جانور چلنے سے رہ گیا۔ اس نے جتنی کوشش کی اس نے حرکت نہیں کی۔ وہ چند میل پیچھے رہ گیا ہے۔ اس نے اپنا اونٹ چھوڑ دیا، اپنا سامان کاندھے پر اٹھایا اور اس گرم ہوا میں پگھلا دینے والی ریت پر چلنا شروع کر دیا۔ پیاس ایسی تھی کہ اسے مارے ڈالتی تھی۔ اس نے ایک ٹیلے پر پہاڑ کی اوٹ میں دیکھا کہ درمیان میں بارش کا پانی جمع ہے۔ اس نے چکھا اور اسے بہت ٹھنڈا اور میٹھا پایا۔ اپنے آپ سے کہا: میں اسے اس وقت تک نہیں پیوں گا جب تک میرے محبوب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے نہ پی لیں۔ اس نے اپنی مشک بھر لی، اسے بھی کاندھے پر اٹھایا اور مسلمانوں کی طرف دوڑا۔

لوگوں نے دور سے ایک سایہ دیکھا اور کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم ایک سائے کو دیکھ رہے ہیں جو ہماری طرف آ رہا ہے۔ فرمایا یقیناً ابوذر ہوگا۔ وہ اور قریب آیا۔ جی ہاں ابوذر ہی تھے۔ لیکن تھکاوٹ اور پیاس سے ان کے پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں یہاں تک کہ وہ پہنچے اور پہنچتے ہی گر پڑے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسے جلد پانی دو۔ اس نے ایک دھیمی آواز میں کہا: پانی میرے ساتھ ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پانی ہے اور تو پیاس سے ہلاک ہونے والا

ہے؟ جی ہاں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں نے پانی چکھا تو مجھے شرم آئی کہ اپنے محبوب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے میں اسے پی لوں!۔[1] سچ ہے۔کیا دنیا کے کس مکتب میں ایسی شیفتگی، بے قراری اور قربانی ہم دیکھتے ہیں؟!

دوسری مثال

ایسے بیقرار عاشقوں میں سے ایک بلال حبشی بھی ہیں۔قریش مکہ انہیں ناقابل برداشت شکنجوں میں ڈالتے اور چلچلاتی دھوپ میں تپتے ہوئے پتھروں پر لٹا کر انہیں ایذا پہنچاتے اور انہیں بتوں کا نام لینے اور بتوں پر ایمان اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیزاری کا اعلان کرنے کے لئے کہتے۔مولانا رومی نے مثنوی کی جلد ششم میں اس کی داستان تعذیب بیان کی ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ مولانا رومی کا یہ بھی شاہکار ہے۔کہتا ہے کہ حضرت ابوبکر انہیں مشورہ دیتے تھے کہ اپنی عقیدت کو پوشیدہ رکھیں لیکن ان میں پوشیدہ رکھنے کی تاب نہ تھی کہ عشق سرے سے سرکش اور خونی ہوتا ہے:

تن فدائی خار می کرد آن بلال
خواجہ اش می زد برائی گوشمال

بلال اپنے جسم کو کانٹوں پر قربان کرتا تھا اس کا مالک اس کو سزا کے طور پر مارتا تھا

کہ شرا تو یاد احمد می کنی
بندۂ بد مکر دین منی

تو کیوں احمد کو یاد کرتا ہے (اور کہتا) میرا غلام ہو کر میرے دین سے انکار کرتا ہے

می زد اندر آفتابش او بہ خار
او احد می گفت بھر افتخار

وہ اسکو دھوپ میں کھڑا کر کے کانٹوں سے مارتا لیکن وہ فخر کے ساتھ احد پکارتا

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۱، ص ۲۱۵-۲۱۶ طبع جدید

تا کہ صدیق آن طرف برمی گذشت!

آن احد گفتن بہ گوش اور برفت

یہاں تک کہ صدیق (حضرت ابوبکر) اس طرف گذرا اور احد کہنے کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی

بعد از آن خلوت بدیدش پندداد

کز یہودان خفیہ می دار اعتقاد!

پھر تنہائی میں (صدیق نے) اس کو مشورہ دیا کہ ان یہودیوں سے اپنا ایمان پوشیدہ رکھو

عالم السّر است پنہاں دار کام

گفت کردم تو بہ پیشت ای ہمام

وہ (خدا) رازوں کا جاننے والا ہے اپنا مقصد پوشیدہ رکھ اس نے کہا اے حضرت میں نے آپ کی نصیحت سے پہلے توبہ کی ہے

توبہ کردن زین نمط بسیار شد

عاقبت از توبہ او بیزار شد

اس طرح میری توبہ بہت ہوگئی ہے اور آخر کار وہ پشیمانی سے بیزار ہوا

فاش کردا، اسپردتن را در بلا

کای محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ای عدوّ توبہ ہا

اپنے کو فاش کر دیا اور جسم کو مصیبت کے سپرد کر دیا، اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اے پشیمانیوں کے دشمن

ای تن من وی رگ من پر ز تو

توبہ را گنجا کجا باشد در او

میرا یہ جسم اور اسکے ہر رگ میں تو ہی تو ہے اس میں پشیمانی کی گنجائش کہاں ہے؟

توبہ رازین پس زردل بیرون کنم
ازحیات خلد توبہ چون کنم؟

میں نے پشیمانی کو اس کے بعد اپنے دل سے باہر نکال پھینکا ہے میں ابدی زندگی سے کیوں پشیمان ہوجاؤں؟

عشق قہا راست و من مقہور عشق
چون قمر روشن شدم از نور عشق

عشق قہار ہے اور میں عشق کا مقہور میں عشق کے نور سے چاند کی طرح روشن ہوا ہوں

برگ کاہم در گفت ای تند باد
من چہ دانم تا کجا خواہم فتاد

اے ہوائے تند میں تیرے ہاتھ میں ایک تنکے کی طرح ہوں مجھے کیا خبر کہ (بالآخر) میں کہاں گر پڑوں گا

گر ہلالم ور بلالم می دوم
مقتدی بر آفتابت می شوم

میں ہلال ہوں یا بلال تیرے آفتاب کی اقتدا میں دوڑتا ہوں

ماہ را باز فتی و زاری چہ کار
در پی خورشید پوید سایہ وار

چاند کو غم وزاری سے کیا کام (وہ تو) سایہ کی طرح سورج کی پیچھے دوڑتا ہے

عاشقان در سیل تند افتادہ اند
برقضای عشق دل بنہادہ اند

عاشق طوفانوں میں کود پڑے ہیں اور اپنے آپ کو عشق کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے

ہمچو سنگ آسیا اندر مدار

روز و شب گردان و نالان بی قرار

وہ چکی کے پاٹ کی طرح گھومتے ہیں دن رات نالہ کرتے اور بے قرار ہیں

ایک اور مثال:

اسلامی مورخین صدر اسلام کے ایک مشہور تاریخی حادثے کو غزوۃ الرّجیع اور جس دن یہ حادثہ ہوا اس کو یوم الرّجیع کا نام دیتے ہیں وہ ایک سننے والی اور دلکش داستان ہے قبیلہ عضل اور قارۃ جن کی ظاہراً قریش کے ساتھ رشتہ داری تھی اور مکّہ کے قرب و جوار میں رہتے تھے ان کے کچھ لوگوں نے ہجرت کے تیسرے سال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا! ہمارے قبیلے کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں، آپ مسلمانوں کی ایک جماعت کو ہمارے درمیان بھیج دیجئے تا کہ وہ ہمیں دن کے معنی سمجھائیں۔ ہمیں قرآن کی تعلیم دیں اور اسلام کے اصول و قوانین ہمیں یاد کرائیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے چھ اشخاص کو اس مقصد کے لئے ان کے ہمراہ بھیجا اور جماعت کی سرداری مرثد ابن ابی مرثد کو یا کسی اور شخص کو جس کا نام عاصم بن ثابت تھا، سونپی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھیجے ہوئے لوگ اس گروہ کے ساتھ جو مدینہ آیا تھا، روانہ ہو گئے، یہاں تک وہ ایک مقام پر جو قبیلہ ہذیل کی جائے سکونت تھا، پہنچے اور وہاں اتر گئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہر طرف سے بے خبر آرام کر رہے تھے کہ اچانک قبیلہ ہذیل کے ایک گروہ نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان پر ننگی تلواروں کے ساتھ حملہ کر دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ گروہ جو مدینہ آیا تھا یا تو شروع سے ہی دھوکہ دینے کا ارادہ رکھتا تھا یا جب وہ اس مقام پر پہنچے تو لالچ میں پڑ گئے اور اپنی بدل ڈالا۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ انہوں نے قبیلہ ہذیل کے ساتھ مل کر سازش کی اور ان کا مقصد ان چھ مسلمانوں کو گرفتار کرنا تھا۔ رسول کے صحابی جوں ہی معاملے سے آگاہ ہوئے تیزی سے اپنے ہتھیاروں کی طرف لپکے اور اپنے دفاع کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن

ہذیلیوں نے قسم کھائی کہ ہمارا مقصد تمہیں قتل کرنا نہیں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ تمہیں قریش مکہ کے حوالہ کریں اوران سے کچھ پیسے لے لیں، ہم اب بھی تمہارے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں کہ تمہیں قتل نہیں کریں گے۔ عاصم ابن ثابت سمیت ان میں سے تین افراد نے یہ کہہ کر کہ ہم مشرک کے ساتھ معاہدے کی رسوائی قبول نہیں کریں گے۔ ان سے جنگ کی اور مارے گئے لیکن دوسرے تین افراد زید بن دئنہ، خبیب بن عدی اور عبداللہ ابن طارق نے کمزوری دکھائی اور ہتھیار ڈال دیئے۔ ہذیلیوں نے ان تین افراد کو مضبوط رسی سے باندھا اور مکہ کی طرف چل دیئے۔ مکہ کے نزدیک پہنچ کر عبداللہ بن طارق نے اپنے ہاتھ کی رسی سے چھڑا لئے اور تلوار کی طرف بڑھائے۔ لیکن دشمن نے موقعہ نہ دیا اروا س کو پتھر مار کر ہلاک کردیا۔ زید اور خبیب مکہ لے جائے گئے اور ہذیل کے دو قیدیوں کے بدلے میں جو اہل مکہ کے پاس تھے ان کو فروخت کردیا اور چل دیئے۔ صفوان ابن امیہ قرشی نے زید کو اس شخص سے خرید لیا جس کے قبضے میں وہ تھا تاکہ بعد یا احد میں مارے جانے والے اپنے باپ کے خون کا انتقال لیتے ہوئے اسے قتل کرے۔ لوگ اس کو قتل کرنے کے لئے مکہ سے باہر لے گئے قریش کے لوگ جمع ہوگئے تاکہ ماجرا دیکھ لیں۔ زید کو لوگ قتل گاہ لے گئے۔ وہ مردانہ وار آگے بڑھا اور ذرا بھی نہ گھبرایا۔ ابوسفیان بھی تماشہ دیکھنے والوں میں شامل تھا اس نے سوچا کہ ان حالات میں زید کی زندگی کے آخری لمحات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے شاید وہ اس (زید) سے کوئی اظہار ندامت و پشیمانی یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت کسی نفرت کا اظہار کرا سکے۔ وہ آگے بڑھا اور زید سے کہا:

تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تو یہ پسند نہیں کرتا کہ اس وقت تیری جگہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتا اور ہم اس کی گردن اڑا دیتے اور تو آرام سے اپنے بیوی بچوں کے پاس چلا جاتا؟

زید نے کہا خدا کی قسم میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں میں کوئی کانٹا بھی چبھے اور میں آرام سے اپنے گھر میں بیوی بچوں کے پاس بیٹھا رہوں۔

حیرت سے ابوسفیان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ دوسرے قریشیوں کی طرف منہ کرکے کہا:

خدا کی قسم میں نے کسی کے دوستوں کو اس سے اس قدر محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جس قدر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دوست اس سے محبت کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد خبیب ابن عدی کی باری آئی اس کو بھی لوگ پھانسی دینے کے لئے مکہ سے باہر لے گئے وہاں اس نے لوگوں سے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت چاہی لوگوں نے اجازت دے دی اس نے انتہائی خصوع وخشوع کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھی اس کے بعد لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

خدا کی قسم اگر یہ تہت نہ آتی کہ تم کہو گے کہ موت سے ڈرتا ہے، تو زیادہ نماز پڑھتا۔

لوگوں نے خبیب کو تختہ دار کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا۔ عین اسی لمحے خبیب بن عدی کی مکمل روحانیت میں ڈوبی ہوئی دلنواز صدا، جس نے سب کو متاثر کیا اور ایک گروہ نے تو خوف خدا سے اپنے آپ کو زمین پر گرادیا، سنی گئی۔ کہ وہ اپنے خدا سے مناجات کر رہا تھا:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا قَدْ بَلَّغْنَا رِسَالَةَ رَسُوْلِكَ فَبَلِّغْهُ الْغُدَاةَ مَا يَصْنَعُ بِنَا،

اَللّٰهُمَّ أَحْصِهِمْ عَدَداً وَاقْتُلْهُمْ بَدَداً وَلَا تُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا.

خدایا! ہم نے تیرے رسول کی طرف سے عائد ذمہ داری پوری کردی ہے میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ آج صبح انہوں نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس سے اس (رسول) کو آگاہ کردے۔ خدایا ان تمام ظالموں کو اپنی نظر میں رکھ اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کردے اور ان میں سے کسی کو باقی نہ رکھ۔ [1]

ایک مثال اور:

جیسا کہ ہم جانتے ہیں احد کے واقعات مسلمانوں کے لئے غم انگیز صورت میں انجام کو پہنچے ستر مسلمان جن میں پیغمبر کے چچا جناب حمزہ بھی شامل ہیں، شہید ہوگئے۔ ابتداء میں مسلمان فتحیاب ہوئے بعد میں ایک گروہ کی بدنظمی سے، جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ایک ٹیلے کے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام جلد دوم، ص ۱۷۹۔ ۱۷۳

اوپر متعین تھا، مسلمان دشمن کے شکنجوں کا نشانہ بنے۔ ایک گروہ مارا گیا اور ایک گروہ منتشر ہو گیا اور تھوڑے سے ہی لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد باقی رہ گئے۔ آخر کار اسی چھوٹے سے گروہ نے دوبارہ فوج کو جمع کیا اور دشمن کو مزید پیش قدمی سے روکا۔ خاص طور پر یہ افواہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید کر دیئے گئے، مسلمانوں کے زیادہ تر پراگندہ ہونے کا سبب بنی مگر جوں ہی انہوں نے سمجھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ ہیں ان کی روحانی قوت لوٹ آئی۔

کچھ زخمی عاقبت سے بالکل بے خبر زمین پر پڑے تھے۔ زخمیوں میں سے ایک سعد ابن ربیع تھا جس کو بارہ گہرے زخم لگے تھے۔ اسی اثنا میں بھاگ جانے والے مسلمانوں میں سے ایک سعد کے پاس پہنچا جبکہ سعد زمین پر پڑا ہوا تھا اور اس سے کہا کہ میں نے سنا ہے پیغمبر مارے گئے ہیں۔

سعد نے کہا: اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مارے گئے ہیں تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خدا تو نہیں مارا گیا، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین بھی باقی ہے تو کیوں بیکار بیٹھا اور اپنے دین کا دفاع نہیں کر رہا۔

ادھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کو جمع کر کے ایک ایک صحابی کو پکار رہے تھے کہ یہ دیکھیں کون زندہ ہے اور کون مارا گیا ہے؟

سعد ابن ربیع کو نہ پایا پوچھا کون ہے جو جائے اور مجھے سعد ابن ربیع کے بارے میں کوئی صحیح اطلاع پہنچائے؟

انصار میں سے ایک نے کہا میں حاضر ہوں۔ جب انصاری پہنچا تو سعد کی زندگی کی مختصر رمق باقی تھی انصاری نے کہا کہ اے سعد! مجھے پیغمبر نے بھیجا ہے کہ میں ان کو اطلاع دوں کہ تو زندہ ہے یا مر گیا؟

سعد نے کہا پیغمبر کو میرا اسلام پہنچا دو اور کہہ دو کہ سعد مرنے والوں میں ہے کیونکہ اس کی زندگی کے چند لمحات سے زیادہ باقی نہیں ہیں پیغمبر سے کہہ دو کہ سعد نے کہا ہے:

خدا تمہیں وہ بہترین جزا دے جو ایک پیغمبر کے لئے سزاوار ہے۔

اس کے بعد انصاری سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میری طرف سے تمام برادران انصار اصحاب پیغمبر کو بھی ایک پیغام پہنچا دو۔ کہہ دو کہ سعد کہتا ہے:

خدا کے نزدیک تمہارے پاس کوئی عذر نہ ہوگا کہ تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی گزند پہنچے اور تمہارے جسموں میں جان باقی ہو۔[1]

صدر اسلام کی تاریخ کے صفحات اس قسم کی شیفتگی، عشق اور حسین واقعات سے پر ہیں۔ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایسا شخص نہیں پایا جاتا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح اپنے دوستوں، ہمعصروں اور اپنے بیوی بچوں کا محبوب ومراد ہو اور اس قدر وجدان کی گہرائیوں سے اسے چاہا ہو۔ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں کہتا ہے:

کوئی بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں نہیں سنتا مگر یہ کہ ان کی محبت اس کے دل میں گھر کر جاتی اور اس کا دل ان کی طرف مائل ہو جاتا اسی لئے قریش مسلمانوں کو مکہ میں قیام کے دور میں صباۃ (دیوانے) کہا کرتے تھے اور کہتے تھے:

نَخَافُ انَّ يَصُبُّوا لوليد بْنِ الْمُغِيرَةِ الى دِينِ مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم)

ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ولید ابن مغیرہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو دل نہ دے بیٹھے

وَلَئِنْ صَبّاً الْوَلِيْدِ وَهُوَ رَيْحَانَةُ قُرَيْشٍ لِيَصَبُّوْنَ قُرَيْشٍ بِأَجْمَعِهَا

اگر ولید جو قریش کا گل سر سبد ہے دل دے بیٹھا تو تمام قریش دل دے بیٹھیں گے۔

وہ کہا کرتے: اس کی باتوں میں جادو ہے اور شراب سے زیادہ مست کرنے والی ہیں وہ اپنے بچوں کو ان کے پاس بیٹھنے سے منع کرتے تھے کہ مبادا ان کی باتیں اور ان کی پرکشش شخصیت ان کو اپنی طرف جذب کر لے۔ جب بھی پیغمبر کعبہ کے گرد حجر اسماعیل میں بیٹھ کر بلند آواز میں قرآن پڑھتے یا خدا کا ذکر کرتے تو وہ اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیتے تا کہ سن نہ سکیں اور کہیں ان کی باتوں کے جادو میں نہ آئیں اور ان کی طرف جذب نہ ہوں۔ وہ اپنے

---

[1] شرح ابن ابی الحدید۔ چاپ بیروت ج سوم، ص ٥٧٤ وسیرۃ ابن ہشام جلد دوم، ص ٩٤

سروں کو کپڑے سے ڈھانپ لیتے اور چہروں کو چھپا لیتے کہ کہیں ان کی پر کشش جبین ان کو اپنی گرفت میں نہ لے۔ اسی لئے اکثر لوگ ان کی باتین سنتے ہی اور ان کی جھلک دیکھتے ہی اور ان کے الفاظ کی حلاوت چکھتے ہی اسلام لے آئے۔ [1]

اسلام کے تاریخی حقائق میں سے ایک جوہر، جو صاحب نظر، انسان شناس محقق، اور ماہر عمرانیات کو حیرت میں ڈالتا ہے وہ انقلاب ہے جو اسلام نے جاہل عربوں میں بر پا کیا۔

معمول کے مطابق اور معمول کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ایسے معاشرے کی اصلاح کے لئے طویل عرصے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں تک کہ رذائل میں پختہ پرانی نسل ختم ہو جائے اور ایک نئی نسل کی بنیاد رکھی جائے لیکن جذب و کشش کے اثر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ ہم نے کہا ہے، "عشق" آگ کے شعلوں کی طرح مفاسد کی جڑوں کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اکثر صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق کرتے تھے اور یہ عشق ہی ہے کہ طویل راستے ایک مختصر عرصے میں طے کئے اور ایک تھوڑی سی مدت میں اپنے معاشرے کو بدل کر رکھ دیا۔

پر و بال ما کمند عشق اوست — موکشانش می کشد تا کوی دوست

اس کے عشق کی کمند ہمارے پر و بال ہیں یہ ہمیں کوئے دوست کی طرف کھینچتا ہے

من چگونہ نور دارم پیش و پس — چون نباشد نور یارم پیش و پس

میں کس طرح اپنا گرد و پیش روشن کر سکتا ہوں جب تک گرد و پیش میرے دوست کی روشنی نہ ہو

نور او در یمن و یسر و تحت و فوق — بر سر و بر گردنم چون تاج وطوق

اس کی روشنی ہی دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہے وہی میرے سر کا تاج اور گلے کا طوق ہے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ جلد دوم، چاپ بیروت، ص۲۲۰

علی علیہ السلام کی محبت قرآن وسنت میں

گذشتہ بحثوں میں محبت کی تاثیراوراس کی قدر و قیمت واضح ہوگئی اور ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ پاک طینت لوگوں کے ساتھ ارادت خود منزل نہیں بلکہ اصلاح اور تہذیب نفس کا ایک ذریعہ ہے۔اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام اورقرآن نے ہمارے لئے کسی محبوب کا انتخاب کیا ہے یا نہیں؟

قرآن سابقہ پیغمبروں کی بات نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انہوں (انبیاءؑ) نے ہمیشہ یہ کہا ہم لوگوں سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتے ہمارا اجر صرف خدا پر ہے۔لیکن پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتا ہے:

قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ [۱]

”کہہ دو میں تم سے کوئی اجر رسالت نہیں مانگتا مگر میرے اقرباء سے محبت۔“

یہ ایک سوال کا مقام ہے کہ کیوں سارے پیغمبروں نے کسی اجر کا مطالبہ نہ کیا اور نبی اکرم نے اپنی رسالت کا اجر طلب کیا اور لوگوں سے اپنے اقرباء کی محبت بطور اجر رسالت چاہی؟ قرآن خود اس سوال کا جواب دیتا ہے:

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ [۲]

”کہہ دو جو اجر میں نے مانگا ہے وہ ایسی چیز ہے جس میں تمہارا اپنا فائدہ ہے، میرا اجر

[۱] سورۃ الشوریٰ: ۲۳

[۲] سورۃ سبا: ۴۷

سوائے خدا کے کسی پر نہیں ہے۔"

یعنی جو کچھ میں نے بہ عنوان اجر رسالت چاہا ہے اس کا فائدہ تمہیں پہنچے گا نہ کہ مجھے، یہ دوستی خود تمہاری اصلاح اور تکامل کے لئے ایک کمند ہے اس کا نام اجر ہے لیکن درحقیقت ایسی بھلائی ہے جو میں تمہارے لئے تجویز کر رہا ہوں۔ اس اعتبار سے کہ اہل بیت اور اقرباء پیغمبر وہ لوگ ہیں جو آلودگی کے قریب نہیں پھٹکتے اور ان کا دامن پاک و پاکیزہ ہے۔

طہارت و پاکیزگی کا خزینہ

ان کے ساتھ عشق و محبت کا نتیجہ حق کی اطاعت اور فضائل کی پیروی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور ان کی محبت ہی ہے ج واکسیر کی طرح ماہیت تبدیل کرتی اور کامل بناتی ہے۔قُربیٰ سے مراد جو بھی ہو یہ بات مسلم ہے کہ علی علیہ السلام اس کا واضح ترین مصداق ہیں،فخرالدین رازی کہتا ہے:

زمخشری نے کشاف میں روایت کی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! وہ قرابت دار جن کی محبت ہم پر واجب ہے،کون ہیں؟ فرمایا علی و فاطمہ سلام اللہ علیہا اور ان کے بچے۔

اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ چار نفر اقربائے پیغمبر ہیں اور لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کے ساتھ محبت ارو ان کا احترام کیا کریں اور اس مطلب پر چند پہلوؤں سے استدلال کیا جاسکتا ہے:

1 آیت "الا المودۃ فی القربیٰ"

2 اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر فاطمہ سلام اللہ علیہا کو بہت زیادہ چاہتے تھے اور فرماتے تھے:

"فاطمہ سلام اللہ علیہا میرے جسم کا ٹکڑا ہے وہ مجھے آزار پہنچاتا ہے جو اسے آزار پہنچائے"۔

اور علی و حسنین علیہم السلام کو بھی دوست رکھتے تھے، جیسا کہ اس سلسلے میں بہت سی متواتر

روایات پہنچی ہیں، پس ان کی محبت ساری امّت پر فرض ہے [۱] کیونکہ قرآن فرماتا ہے:

وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ. [۲]

یعنی پیغمبر کی پیروی کروتا کہ تم راہ ہدایت پا جاؤ۔

اور پھر فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. [۳]

تمہارے لئے اللہ کے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔

یہ سب (آیات) دلیل ہے کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو علی علیہ السلام و فاطمہ سلام اللہ علیہا اور حسنین علیہما السلام ہیں، کی محبت تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔ [۴]

حضرت علی علیہ السلام کی محبت اور دوستی کے سلسلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور بھی بہت سی روایات ہم تک پہنچی ہیں:

(۱) ابن اثیر نقل کرتا ہے پیغمبر نے علی علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اے علیؑ! خدا نے تم کو ایسی چیزوں سے زینت دی ہے کہ اس کے بندوں کے نزدیک ان سے زیادہ محبوب اور کوئی زینت نہیں ہے۔

دنیا سے کنارہ کشی نے تجھے اتنا سکون دیا کہ نہ تو دنیا کی کسی چیز سے بہرہ مند ہوتا ہے اور نہ وہ تجھ سے، تجھے مساکین کی محبت بخشدی، وہ تیری امامت پر خوش ہیں اور تو ان کی اطاعت و

---

[۱] پیغمبر کی ان سے محبت شخصی پہلو نہیں رکھتی یعنی صرف اس لئے نہیں ہے کہ مثلاً آپ کی اولاد یا اولاد کی اولاد ہے اور یہ کہ ان کی جگہ اگر اور لوگ ہوتے تو پیغمبر ان کو چاہتے بلکہ پیغمبر اس لئے ان کو دوست رکھتے تھے کہ وہ مثالی افراد تھے اور خدا ان کو دوست رکھتا تھا ورنہ پیغمبر کی اور بھی اولاد تھی جن سے نہ خود ان کو اس طرح کی محبت تھی اور نہ امّت پر اس طرح فرض ہے۔

[۲] اعراف:۱۵۸

[۳] سورۂ احزاب:۲۱

[۴] التفسیر الکبیر فخر الدین رازی۔ج ۲۷،ص ۱٦٦، چاپ مصر

پیروی پر خوشحال ہے وہ شخص جو تجھ کو دوست رکھتا ہے اور تیری دوستی میں سچا ہے اور افسوس ہے اس پر جو تجھ سے دشمنی رکھتا ہے اور تیرے خلاف جھوٹ بولتا ہے۔ [1]

(۲) سیوطی روایت کرتا ہے کہ پیغمبر نے فرمایا:

علی علیہ السلام کی دوستی ایمان ہے اور اس کی دشمنی نفاق۔ [2]

(۳) ابونعیم روایت کرتا ہے کہ پیغمبر نے انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز نہ دکھاؤں کہ اگر تم نے اس کو مضبوطی سے تھام لیا تو میرے بعد ہر گز گمراہ نہیں ہو گے؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول!

فرمایا: یہ علی علیہ السلام ہیں ان سے محبت کرو جس طرح مجھ سے محبت کرتے ہوئے اور اس کا احترام کرو جس طرح میرا احترام کرتے ہو کیونکہ خدا نے جبرئیل کے ذریعہ مجھے حکم دیا ہے کہ یہ بات تمہیں بتا دوں۔ [3]

نیز اہل سنت نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کئی روایتیں نقل کی ہیں کہ ان روایتوں میں علی علیہ السلام کے چہرے کی طرف دیکھنا اور علی علیہ السلام کی فضیلت بیان کرنے کو عبادت قرار دیا گیا ہے۔

(۱) محب طبری حصرت عائشہؓ سے روایت کرتا ہے انہوں نے کہا:

میں نے اپنے باپ کو دیکھا کہ علی علیہ السلام کی چہرے کی طرف بہت زیادہ دیکھتے میں نے کہا: بابا جان! میں دیکھتی ہوں کہ آپ علی علیہ السلام کے چہرے کی طرف بہت زیادہ دیکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: اے میری بیٹی! میں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ فرمایا: علی علیہ السلام

---

[1] سادالغابہ، ج ٤، ص ٢٣

[2] کنز العمال جمع الجوامع سیوطی، ج ٢، ص ١٥٦

[3] حلیۃ الاولیاء، ج ١، ص ٦٣۔ اس سلسلے میں روایات بہت زیادہ ہیں اور ہم نے اہلسنت کی کتابوں میں نوے سے زیادہ ایسی روایات دیکھی ہیں جن کا موضوع علی علیہ السلام کی محبت اور دوستی ہے اور کتب شیعہ میں یہی بہت زیادہ روایات آئی ہیں اور مجلسی مرحوم نے بحار الانوار ج ٣٩، چاپ جدید میں حبّ وبغض امیر المومنین،، کے بارے میں ایک باب رکھا ہے اور اس باب میں ١٢٣ روایات نقل کی گئی ہیں۔

کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔ [۱]

(۲) ابن حجر حضرت عائشہ سے روایت کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرا بہترین بھائی علی علیہ السلام ہے اور بہترین چچا حمزہ ہے اور علی علیہ السلام کا ذکر اور اس کی فضیلت بیان کرنا عبادت ہے۔ [۲]

علی علیہ السلام لوگوں میں خدا اور سول کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہیں اور لازمی طور پر بہترین محبوب ہیں۔

(۳) انس ابن مالک کہتا ہے: ہر روز انصار کے بچوں میں سے ایک پیغمبر کے کاموں کو انجام دیا کرتا تھا، ایک روز میری باری تھی امّ ایمن نے ایک بھنا ہوا پرندہ پیغمبر کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول اس پرندے کو میں نے خود پکڑا ہے اور آپ کی خاطر پکایا ہے۔

حضرت نے فرمایا: خدایا! اپنے محبوب ترین بندے کو بھیج دے کہ وہ میرے ساتھ مل کر یہ مرغ کھائے۔ اسی اثناء میں دروازہ کھٹکھٹایا گیا پیغمبر نے فرمایا: انس دروازہ کھول! میں نے اپنے دل میں کہا خدا کرے یہ کوئی انصاری ہو لیکن میں نے دروازے کے پیچھے علی علیہ السلام کو دیکھا، میں نے کہا کہ پیغمبر ایک کام میں مشغول ہیں اور واپس آ کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا پیغمبر نے فرمایا: دورازہ کھول دو۔ میں پھر دعا کرتا تھا کہ کوئی انصاری ہو۔ میں نے دورازہ کھولا دوبارہ علی علیہ السلام تھے۔ میں یہ کہہ کر کہ پیغمبر کام میں مشغول ہیں واپس آ گیا اور اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا پیغمبر نے فرمایا: جاؤ اور دروازہ کھول دو اور اس کو گھر میں لے آؤ تو پہلا شخص نہیں ہے جو اپنی قوم سے محبت کرتا ہے وہ انصاری نہیں ہے۔ میں گیا اور علی علیہ السلام کو گھر لے آیا اور انہوں نے پیغمبر کے ساتھ بھنا ہوا پرندہ کھالیا۔ میں گیا۔ [۳]

---

[۱] ریاض النصرۃ ج ۲، ص ۲۱۹۔ تقریباً ۲ روایات اسی موضوع پر کتب اہل سنت سے نقل کی گئی ہیں۔
[۲] الصواعق المحرقہ ص ۷۴ اور اس موضوع پر پانچ اور روایات اہل سنت کی مختلف کتابوں سے نقل کی گئی ہیں۔
[۳] مستدرک الصحیحین ج ۳، ص ۱۳۱۔ یہ واقعہ مختلف انداز میں اٹھارہ سے زیادہ طریقوں سے اہلسنت کی معتبر کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔

جاذبۂ علی علیہ السلام کا راز

دلوں میں علی علیہ السلام کی دوستی اور محبت کی رمز کیا ہے؟ محبت کا راز آج تک کوئی کشف نہیں کر سکا ہے یعنی اس کا کوئی فارمولا نہیں بنایا گیا اور کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو ایسا ہوگا اور ایسا ہوا تو ایسا، لیکن ایک راز ہے ضرور۔ محبوب میں ایسی کوئی چیز ضرور ہے جس کا حسن چاہنے والے کی نظر کو خیرہ کر دیتا ہے اور اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے جاذبہ ارو محبت کو بلند سطح پر عشق کہا جاتا ہے علی علیہ السلام دلوں کے محبوب اور انسانوں کے معشوق ہیں۔ کیوں؟ کس لحاظ سے؟ علی علیہ السلام میں کونسی غیر معمولی چیز ہے کہ عشق کے جذبات کو ابھارتی اور دلوں کو اپنا شیدا بناتی ہے۔علی علیہ السلام کیونکر ابدی زندگی کا انداز لئے ہوئے ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں؟ دل کیوں علی علیہ السلام کی طرف کھینچتے ہیں اور ان کو اصلاً مردہ نہیں محسوس کرتے بلکہ زندہ پاتے ہیں؟

یہ بات مسلم ہے کہ ان کی محبت کا اثاثہ ان کا جسم نہیں ہے کیوں کہ ان کا جسم اس وقت ہمارے درمیان نہیں ہے ارہم ان کو محسوس نہیں کرتے اور پھر علی علیہ السلام کی محبت ہیرو پرستی کی قسم سے نہیں ہے جو ہر قوم میں موجود ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ علی علیہ السلام کی محبت اخلاقی اور انسانی خوبیوں کے ساتھ محبت کی وجہ سے ہے اور علی علیہ السلام سے محبت انسانیت سے محبت ہے۔ یہ درست ہے کہ علی علیہ السلام انسان کامل کا مظہر ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ انسان انسانیت کی اعلیٰ مثالوں کو دوست رکھتا ہے لیکن اگر علی علیہ السلام ان تمام انسانی فضائل کے حامل ہوتے جو کہ وہ تھے وہ حکمت، وہ علم، وہ فداکاریاں، وہ ایثار، وہ تواضع وانکساری، وہ ادب، وہ ادب، وہ لطف ومحبت، وہ ضعیف پروری، وہ عدالت، وہ حریت پسندی، وہ احترام انسانیت، وہ شجاعت، وہ مروت ومرادنگی جو دشمن کی نسبت

تھی اور بقول مولوی:

در شجاعت شیرِ ربّانیستی　　در مروت خود کہ داند کیستی ؟

تم شجاعت میں شیر خدا ہو لیکن نہ معلوم مروت میں کیا ہو؟

وہ سخاوت اور جود و کرم ۔۔۔اگر علی علیہ السلام یہ تمام (صفات) رکھتے جیسا کہ رکھنے تھے اور رنگ الٰہی نہ رکھتے ،تو مسلماً اس قدر مہر و محبت پیدا کرنے والے نہ ہوتے جیسے کہ آج ہیں۔علی علیہ السلام اس اعتبار سے محبوب ہیں کہ خدا کے ساتھ ان کا تعلق ہے۔ ہمارے دل غیر شعوری طور پر پوری گہرائی کے ساتھ حق کے ساتھ پیوستہ ہیں اور چونکہ علی علیہ السلام کو حق کی عظیم نشانی اور صفات حق کا مظہر سمجھتے ہیں، اس کے ساتھ عشق کرتے ہیں۔ درحقیقت عشق علی علیہ السلام کے پیچھے حق کے ساتھ روح کا وہ رشتہ ہے جو ہمیشہ فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اور چونکہ فطرت جاودانی ہے، علیؑ کی محبت بھی جاوداں ہے۔

علی علیہ السلام کے وجود میں روشن پہلو بہت زیادہ ہیں لیکن جس چیز نے علی علیہ السلام کو ہمیشہ درخشندہ اور تاباں قرار دے رکھا ہے وہ ان کا ایمان اور اخلاص ہے اور یہی ہے جس نے ان کو جذبۂ الٰہی دے دیا ہے۔

علی علیہ السلام کی فداکار اور دلدادہ خاتون سودۂ ہمدانی نے معاویہ کے سامنے علی علیہ السلام پر درود بھیجا اور ان کی شان میں کہا:

صل الاله علی روح تضمنها

قبرفا صبح فیه العدل مدفونا

قد حالف الحق لا یبغی به بدلا

فصار بالحق و الایمان مقرونا

اس وجود پر خدا کی رحمت ہو جس کو مٹی نے لے لیا اور اس کے ساتھ عدل بھی دفن ہو گیا اس نے حق کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اس کا کوئی نعم البدل نہ ہو پس حق اور ایمان کے قریب ہوا۔

صعصعہ بن صوحان عبدی بھی علی علیہ السلام کے عاشقوں میں سے ایک تھا وہ ان چند لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے اس رات علی علیہ السلام کی تدفین میں شرکت کی تھی۔ حضرت کو دفن کرنے اوران کے جسم مبارک کو خاک کے اندر چھپانے کے بعد صعصعہ نے اپنا ایک ہاتھ اپنے سینے پر مارا اور دوسرے ہاتھ سے سر میں مٹی ڈالتے ہوئے کہا:

تجھے موت مبارک ہو! تیری جائے پیدائش پاک تھی۔ تیرا صبر طاقتور اور تیرا جہاد عظیم۔ تو نے اپنی فکر پر غلبہ پالیا اور تیری تجارت منافع بخش رہی۔

تو اپنے پیدا کرنے والے کا مہمان ہوا اور اس نے تجھے خوشی سے قبول کیا اور اس کے فرشتے تیرے گرد جمع ہو گئے۔ پیغمبر کی ہمسائیگی میں جاگزیں ہوا اور خدا نے تجھے اپنے قریب جگہ دی اور تو اپنے بھائی مصطفیٰ کے درجہ کو جا پہنچا اور اس نے جام لبریز سے تجھے سیراب کیا۔

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم تیری پیروی کریں اور تیری روش پر عمل کریں تیرے دوستوں کو دوست اور تیرے دشمنوں کو دشمن رکھیں اور تیرے دوستوں کے ساتھ محشور ہوں۔

تو نے وہ پالیا جو دوسرے نہ پا سکے اور وہاں پہنچا جہاں دوسرے نہ پہنچ سکے تو نے اپنے بھائی کے سامنے جہاد کیا اور دین حدا کے لئے شایان طریقے سے قیام کیا یہاں تک کہ تو نے سنتوں کو برپا کیا اور خرابیوں کی اصلاح کی اور ایمان و اسلام منظم ہو گیا تجھ پر بہترین رحمتیں ہوں۔

تیرے وسیلے سے مومنوں کی پیٹھ مضبوط ہوئی اور راہیں روشن ہو گئیں اور سنتیں قائم ہو گئیں کسی نے بھی اپنے اندر تیری رفعتوں اور فضیلتوں کو جمع نہ کیا۔ تو نے پیغمبر کی ندا پر لبیک کہی اور ایسا کرنے میں اوروں پر سبقت حاصل کی تو اس کی مدد کے لئے لپکا اور اپنی جان سے اس کی حفاظت کی۔ خوف و خطر کے موقعوں پر اپنی

شمشیر ذوالفقار کے ساتھ تو نے حملے کئے اور ظالموں کی کمر توڑ دی۔ کفر اور شرک کی بنیادوں کو مسمار کر دیا اور گمراہوں کو خاک وخون میں لٹا دیا پس مبارک ہو اے مومنوں کے سردار۔

تو سب لوگوں سے زیادہ پیغمبر کے قریب تھا، تو ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اسلام قبول کیا، تو یقین سے سرشار، دل محکم اور سب سے زیادہ فدا کاری کرنے والا تیرا حصہ نیکی میں سب سے زیادہ تھا، خدا ہمیں تیری مصیبت کے اجر سے محروم نہ کرے اور تیرے بعد ہمیں رسوا نہ کرے۔

خدا کی قسم تیری زندگی نیکیوں کی کنجی تھی اور شر کے لئے قفل اور تیری موت ہر شر کے لئے کنجی اور ہر خیر کے لئے قفل ہے۔ اگر لوگ تجھے قبول کر بیٹھے ہوتے تو زمین اور آسمان سے ان پر نعمتوں کی بارش ہوتی لیکن انہوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کو منتخب کیا۔ [1]

جی ہاں! لوگوں نے دنیا کو منتخب کیا اور وہ علی علیہ السلام کے عدل اور عزم کی تاب نہ لا سکے اور آخر کار ایسے ہی لوگوں کی آستین سے جمود اور عصبیت کے ہاتھ باہر نکل آئے اور علی علیہ السلام کو شہید کر دیا۔

علی علیہ السلام دوست اور چاہنے والے ایسے دیوانوں کے سلسلے میں جنھوں نے ان کی محبت کی راہ میں سر دیا ہے اور جو سولی پر لٹکائے گئے، اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتے تاریخ اسلام کے صفحات کو ان شگفتہ، خوبصورت اور حیرت انگیز کارناموں پر فخر ہے زیاد ابن ربیہ اس کا بیٹا عبداللہ، حجاج ابن یوسف متوکل عباسی اور ان سب سے بڑھ کر معاویہ ابن ابی سفیان جیسے لوگوں کے مجرم اور ناپاک ہاتھ کہنیوں تک انسانیت کے ان سپوتوں کے خون سے آلودہ ہیں۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۴۲، ص ۲۹۵۔۲۹۶ چاپ جدید

دافعۂ علی علیہ السلام کی قوت

علی علیہ السلام کی دشمن سازی

ہم اپنی بحث کو ان کے چار سال اور چند ماہ کی دور خلافت تک محدود رکھیں گے علی علیہ السلام ہمیشہ سے دوہری شخصیت رکھتے تھے، علی علیہ السلام ہمیشہ جاذبہ بھی رکھتے تھے اور دافعہ بھی خاص طور پر عصر اسلام کی ابتداء سے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گروہ علی علیہ السلام کے گرد گھومتا ہے اور دوسرا ان سے کوئی خاص لگاؤ نہیں رکھتا اور غالباً ان کے وجود سے ہی ناخوش ہے۔

لیکن خلافت علی علیہ السلام اور ان کی وفات کے بعد کے ادوار یعنی علی علیہ السلام کے ظہور تاریخی کا دور، ان کے جاذبہ و دافعہ کے بیشتر ظہور کا دور ہے۔ خلافت سے قبل معاشرے سے ان کا رابطہ جتنا کم تھا اسی نسبت سے ان کے جاذبہ و دافعہ کا ظہور بھی کم تر تھا۔

علی علیہ السلام لوگوں کو اپنا دشمن بنانے اور ان کو ناراض کرنے والے شخص تھے اور یہ ان کا دوسرا بڑا افتخار ہے۔ ہر مسلک اور ہدف رکھنے والا مجاہد انسان خاص کر انقلابی جو اپنے مقدس مقاصد کو عملی شکل دینے کی کوشش کرتا ہو اور جو خدا کے اس قول کا مصداق ہو کہ:

یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم

(سورۂ مائدہ آیت نمبر ٥٤)

وہ خدا کی راہ میں کوشش کرتے ہیں اور ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں کرتے۔

وہ لوگوں کو اپنا دشمن بنانے اور ان کو ناراض کرنے والا ہوتا ہے۔ لہذا ان کے دشمن خاص کر ان کے اپنے زمانے میں اگر ان کے دوستوں سے زیادہ نہیں تھے تو کم بھی نہ تھے اور نہیں

ہیں۔ اگر آج علی علیہ السلام کی شخصیت میں تحریف نہ کی جاۓ اور جس طرح وہ ہے اسی طرح پیش کی جائۓ تو ان کی دوستی کے بہت سے دعویداران کے دشمنوں کے مترادف قرار پائیں گے۔

پیغمبر نے علی علیہ السلام کو ایک لشکر کا سپہ سالار بنا کر یمن کی طرف بھیجا۔ واپسی میں انہوں نے پیغمبر سے ملاقات کے لئے مکّہ کا عزم کیا۔ مکّہ کے قریب پہنچ کر سپاہیوں میں سے کسی کو اپنی جگہ مقرر کر کے وہ پہلے ہی سفر کی روداد سنانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف چل دیئے۔ اس شخص نے وہ تمام کپڑے جو علی علیہ السلام اپنے ہمراہ لائے تھے۔ سپاہیوں میں تقسیم کر دیئے تا کہ وہ نئے کپڑے پہن کر وارد مکہ ہو جائیں علی علیہ السلام جب واپس آئے تو اس عمل پر اعتراض کیا اور اس کو نظم وضبط کے خلاف ہو جاتا کیونکہ پیغمبر سے حکم حاصل کئے بغیر ان کپڑوں کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جانا چاہیے تھا اور درحقیقت علی علیہ السلام کی نظر میں یہ مسلمانوں کے پیشوا کی اطلاع اور اجازت کے بغیر بیت المال میں تصرف تھا اسی لئے علی علیہ السلام نے حکم دیا کہ وہ لوگ کپڑوں کو اپنے جسم سے اتار دیں اور ان کو مخصوص جگہ پر رکھا تا کہ پیغمبر کی تحویل میں دے دیا جائے اور آنحضرت خود ان کے بارے میں فیصلہ فرمائیں۔ علی علیہ السلام کے لشکری اس عمل سے ناخوش ہوئے جوں ہی وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور پہنچے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا حال پوچھا تو کپڑوں کے سلسلے میں علی علیہ السلام کی سخت گیری کی شکایت کی۔ پیغمبر نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

لَا تَشْکُوا عَلِیّاً فَوَ اللهِ أَنَّهُ لأخشن فِی ذَاتِ اللهِ أَوْ فِی سَبِیلِ اللهِ مِنْ أَنْ یُشْکِی.[1]

اے لوگو! علی علیہ السلام کی شکایت نہ کرو خدا کی قسم وہ خدا کی راہ میں اس سے زیادہ سخت ہیں کہ کوئی اس کے خلاف شکایت کرے۔

خدا کی راہ میں علی علیہ السلام کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے بلکہ اگر کسی پر مہربانی کرتے اور کسی کا لحاظ کرتے تو وہ خدا کے لئے ہوتا۔ یہ صورت حال یقیناً لوگوں کو اپنا دشمن بنانے والی ہے اور لالچ

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ٤، ص ٢٥٠

اور آرزو سے پر دلوں کو رنجیدہ کرنے اور تکلیف پہنچانے والی ہے۔

پیغمبر کے اصحاب میں کوئی شخص علی علیہ السلام کی طرح فدا کار دوست نہیں رکھتا جس طرح ان کی مانند کوئی شخص ایسے گستاخ اور خطرناک دشمن نہیں رکھتا۔ وہ ایسے شخص تھے کہ جس کی موت کے بعد اس کا جنازہ بھی دشمنوں کے حملے کا نشانہ بنا۔ وہ خود اس معاملے سے آگاہ تھے اور اس کی پیش بینی کیا کرتے تھے اسی لئے انہوں نے وصیت کی کہ ان کی قبر مخفی رکھی جائے اور ان کے فرزندوں کے علاوہ کوئی اسے نہ جانتا ہو، یہاں تک کہ تقریباً ایک صدی گزر گئی اور اموی سلطنت ختم ہوگئی، خوارج بھی ختم یا سخت کمزور ہو گئے، کینے اور کینہ توزیاں کم ہوگئیں اور امام جعفر صادق کے ہاتھوں ان کا مزار مقدّس کو ظاہر کیا گیا۔

ناکثین وقاسطین ومارقین

علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے دوران تین گروہوں کو اپنے سے دور پھینکا اور ان کے ساتھ برسر پیکار رہے۔ اصحاب جمل جن کو آپ نے ناکثین کا نام دیا۔ اصحاب صفّین جن کو قاسطین کہا اور اصحاب نہروان یعنی خوارج جن کو آپ نے مارقین کے نام سے پکارا: [۱]

فَلَمَّا نَهَضْتُ بِالْأَمْرِ نَكَثَتْ طَائِفَةٌ وَ مَرَقَتْ أُخْرَى وَ [فَسَقَ] قَسَطَ آخَرُونَ. [۲]

پس جب میں نے امر خلافت کا فیصلہ کیا تو ایک گروہ نے بیعت توڑ ڈالی، ایک گروہ دین سے نکل گیا ایک گروہ نے سرکشی اور بغاوت کر ڈالی۔

---

[۱] اور آپ سے پہلے پیغمبر نے ان کو انہیں ناموں سے پکارا کہ ان سے فرمایا ستقاتل بعدی الناکثین والقاسطین والمارقین،، یعنی میرے بعد (اے علی علیہ السلام) ناکثین، قاسطین اور مارقین کے ساتھ جنگ کرو گے۔ اس روایت کو ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ ج۱، ص۲۰۱۔ میں نقل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ روایت حضرت ختمی مرتبت کی نبوت کے دلائل میں سے ایک ہے کیونکہ یہ مستقبل اور غیب کے بارے میں ایسی صریح خبر ہے جس میں کوئی تاویل یا اجمال کی گنجائش نہیں ہے۔

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ شقشقیہ

ناکثین ذہنی طور پر زبردست لوگ تھے جو لالچی اور طبقاتی نظام کے طرفدار تھے عدالت ومساوات کے بارے میں ان کی بیشتر گفتگوانہی لوگوں کے بارے میں ہے۔

لیکن قاسطین کی ذہنیت وسیاست، دورنگی اور منافقت تھی۔ وہ زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے علی علیہ السلام کی حکومت اوران کے اختیارات کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں سے بعض نے تجویز پیش کی ان کے قریب آجائیں اور کسی حدتک ان کے مفادات کی ضمانت دیں لیکن انہوں (علی علیہ السلام) اس لئے آئے تھے کہ ظلم کا مقابلہ کیا جائے نہ اس لئے کہ ظلم کی تائید کریں اور دوسری جانب معاویہ اور اسی قماش کے لوگ سرے سے علی علیہ السلام کی حکومت کے ہی مخالف تھے وہ چاہتے تھے کہ خلافت اسلامی کی مسند پر خود قبضہ کریں اوران کے ساتھ علی علیہ السلام کی جنگ درحقیت نفاق اور دورنگی سے جنگ تھی۔

تیسرا گروہ جو مارقین کا ہے ان کی ذہنیت ناروا عصبیت، خشک تقدس اور خطرناک جہالت تھی۔علی علیہ السلام ان تمام کی نسبت ایک طاقتور دافعہ اورغیر مصالحانہ رویّہ رکھتے تھے۔

علی علیہ السلام کی ہمہ گیری اوران انسان کامل ہونے کا ایک مظہر یہ ہے کہ اپنے اختیار وعمل کی بناء پران کو گوناگوں فرقوں اور مختلف انحرافات کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے ان سب سے جنگ کی۔ ہم کبھی ان کو زر پرستوں اور شتر سوار دنیا پرستوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کبھی رووصدر وسیاست پیشہ لوگوں کے ساتھ اور کبھی جاہل اور منحرف مقدس نما لوگوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

ہم اپنی بحث کو آخری گروہ یعنی خوارج کی طرف منعطف کریں گے۔ یہ اگرچہ اب ختم ہو چکے ہیں لیکن یہ ایک سبق آموز اور عبرت انگیز تاریخ رکھتے ہیں ان کے خیالات تمام مسلمانوں میں پھیل چکے ہیں۔جس کے نتیجے میں چودہ سوسال کی طویل تاریخ میں اگرچہ وہ لوگ اور حتیٰ کہ ان کے نام بھی ختم ہو چکے ہیں لیکن ان کی روح مقدس نما لوگوں کی شکل میں ہمیشہ باقی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھی جاتی ہے۔

خوارج کاظہور

خوارج یعنی شورشی، یہ لفظ خروج [1] سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں سرکشی اور بغاوت۔ ان کا ظہور حکمیت کے معاملے سے ہوا ہے۔ جنگ صفین میں آخری روز جبکہ

یہ ایسے لوگ بھی تھے جن کو خروج کرنے کا موقعہ کبھی نہ ملا لیکن وہ خوارج کے عقیدہ پر ایمان رکھتے تھے جیسا کہ عمرو بن عبید اور بعض اور معتزلیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ معتزلہ کے کچھ لوگ امر بالمعروف نہی از منکر اور یا گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے کے لئے عذاب مخلّد (ہمیشہ کا عذاب) کے مسئلہ میں خوارج کے ہم فکر تھے اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

---

[1] کلمۂ خروج،، اگر متعدّی بہ علیٰ،، ہو تو اس کے دو معنی نکلتے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ایک جنگ اور لڑائی سے نکل آنا اور دوسرے سرکشی، نافرمانی اور شورش۔

خرج فلان علیٰ فلان: برز لقتاله. و خرجت الرعية على الملك: تمردت (المنجد)

لفظ خوارج،، جس کے لئے فارسی میں شورشیاں،، کا لفظ بولا جاتا ہے، وہ خروج،، سے دوسرے معنی میں لیا گیا ہے۔

اس گروہ کو خوارج اس لئے کہا گیا ہے کہ انہوں نے علی علیہ السلام کے حکم سے سرتابی کی اور ان کے خلاف شورش برپا کی اور چونکہ اپنی سرکشی کی بنیاد ایک عقیدہ اور مسلک پر رکھی لہٰذا اسی طرح نامزد ہو گئے اور یہ نام ان کے لئے مختص ہو گیا۔ اسی لئے وہ تمام لوگ جنہوں نے قیام کیا اور حاکم وقت سے بغاوت کی خارجی نہیں کہلائے۔ اگر یہ کوئی مذہب عقیدہ نہ رکھتے تو بعد کے بغاوت کرنے والوں کی طرح ہوتے لیکن یہ کچھ عقائد رکھتے تھے جن کو بعد میں مستقل حیثیت مل گئی۔ اگرچہ یہ کسی وقت بھی کوئی حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن اپنے لئے ایک فقہ اور ادب تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (ضحی الاسلام ج ۳، ص۲۷۰، ۲۴۷ طبع ششم کی طرف رجوع کیا جائے)

و کا یری برأی الخوارج

یعنی خوارج کی طرح سوچتے ہیں۔

حتی کہ چند عورتیں بھی تھیں۔ کامل مبرّد ج ۲، ص ٤ ٥ میں ایک ایسی عورت کی داستان نقل کی گئی ہے جس کا عقید ہخارجیوں کا سا تھا۔ اس اعتبار سے اس لفظ کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں عام خاص من وجہ کی نبست ہے۔

جنگ علی علیہ السلام کی فتح کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچ رہی تھی، معاویہ نے عمرو ابن عاص کے مشورے سے ایک ماہرانہ چا چلی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی تمام کوششیں اور زحمتیں بے کار گئیں اور یہ کہ شکست اور اس کے درمیان ایک قدم سے زیادہ فاصلہ نہیں رہا اس نے سوچا کہ فریب کے علاوہ نجات کا اور کوئی راستہ نہیں ہے اس نے حکم دیا کہ لوگ نیزوں پر قرآن کو بلند کریں اور کہیں کہ لوگو! ہم قبلہ ٔ وقرآن کو ماننے واے ہیں آ ؤ ہم اس کو اپنے درمیان حکم قرار دیتے ہیں۔ یہ کوئی نئ بات نہ تھی جو انہوں نے نکالی ہو، یہی بات اس سے پہلے علی علیہ السلام نے کہی تھی اور جس کو انہوں نے تسلیم نہیں کیا تھا اور اب بھی وہ اس کو (دل سے) تسلیم نہیں کر رہے تھے، بلکہ ایک بہانہ تھی کہ نجات کا راستہ اور یقینی شکست سے چھٹکارا پائیں۔ علی علیہ السلام نے پکارا، مار وان کو، یہ قرآن کے صفحہ اور کاغذ کو بہانہ بنا کر قرآن کے لفظ اور کتابت کی پنا میں اپنا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں اور بعد میں قرآن کے خلاف اپنی روش پر باقی رہیں گے۔ قرآن کا کاغذ اور اس کی جلد کی حقیقت قرآن کے مقابلے میں کوئی قیمت وعزت نہیں رکھتی۔ قرآن حقیقت اور اس کا صحیح جلوہ میں ہوں۔ انہوں نے کاغذ اور خط کو ہاتھوں میں اٹھایا ہے تا کہ حقیقت اور معنی کو نابود کریں۔

بعض جاہل اور بے معرفت مقدس نما لوگوں نے جن کی ایک بڑی تعداد تھی، ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا کہ علی علیہ السلام کیا کہتے ہیں؟

انہوں نے شور مچایا کہ ہم قرآن کے ساتھ جنگ کریں؟ ہماری جنگ تو قرآن کو زندہ رکھنے کے لئے ہے جب وہ بھی قرآن کو تسلیم کر رہے ہیں تو پھر جنگ کس لیے؟

علی علیہ السلام نے کہا: میں اب بھی کہتا ہوں کہ تم قرآن کی خاطر جنگ کرو۔ ان لوگوں کو قرآن سے کوئی سروکار نہیں ہے، انہوں نے قرآن کے الفاظ اور اس کی تحریر کو اپنی جان بچانے کا وسیلہ قرار دے رکھا ہے۔

اسلامی فقہ میں جہاد کے بارے میں "کفّار کا مسلمانوں کو ڈھال بنانا" کے عنوان سے ایک مسئلہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر دشمنان اسلام مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں چند مسلمان قیدیوں کو اگلے محاذ پر اپنے لئے ڈھال قرار دیں اور خود محاذ کے پیچھے کارروائی اور پیش قدمی میں مشغول ہوں اور صورت حال ایسی ہو کہ اسلامی فوج کے لئے اپنا دفاع کرنے یا ان پر حملہ کر کے ان کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو کہ ان مسلمان بھائیوں کو جو ڈھال بنا دیئے گئے ہیں حکم ضرورت کے تحت ختم کر دیا جائے، یعنی حملہ آور دشمن پر قابو پانا مسلمانوں کو قتل کئے بغیر ممکن نہ ہو تو یہاں اسلام کے بلند مقاصد اور باقی مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت کے لئے مسلمان کا قتل، اسلامی قانون کے تحت جائز قرار دیا گیا ہے۔ وہ بھی اسلام کے سپاہی ہیں اور راہ خدا میں شہید ہوئے ہیں۔ منتہا یہ ہے کہ ان کے پسماندگان کو مسلمانوں کے سرمایہ (بیت المال) سے ان کا خون بہا ادا کر دیا جائے [1] اور یہ صرف فقہ اسلامی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کے فوجی اور جنگی قوانین میں ایک مسلم قانون ہے کہ اگر دشمن داخلی قوتوں سے فائدہ اٹھانا چاہے، تو ان قوتوں کو ختم کرتے ہیں تاکہ دشمن پر قابو پا سکیں اور اس کو پسپا کر دیں۔

ایسی صورت میں جبکہ ایک زندہ مسلمان کے بارے میں اسلام کہتا ہے کہ اس کو قتل کر دو تاکہ اسلام کو فتح ملے تو کاغذ اور جلد کے بارے میں تو بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کاغذ اور تحریر کا احترام معنی اور مضمون کی وجہ سے ہوتا ہے، آج جنگ قرآن کے مضمون کی خاطر ہے انہوں نے کاغذ کو وسیلہ قرار دے دیا ہے تاکہ قرآن کے معنی اور مضمون کو مٹا دیں۔

لیکن نادانی اور جہالت نے سیاہ پردے کی طرح ان کی عقل کی آنکھوں پر قبضہ کر لیا

---

[1] لمعہ ج ۱، کتاب الجہاد فصل اول۔ و شرائع الاسلام کتاب الجہاد

اوران کوحقیقت سے دور رکھنا۔ کہنے لگے کہ ہم نہ صرف یہ کہ قرآن کے ساتھ جنگ نہیں کریں گے بلکہ چونکہ قرآن کے ساتھ جنگ خود ایک منکر (برائی) ہے اس لئے اس سے نہی (روکنے) کی بھی کوشش کریں گے اور جولوگ قرآن کے ساتھ جنگ کریں ان کے استھ جنگ کریں گے۔ آخری فتح میں لمحے سے زیادہ کی دیر نہ تھی کہ مالک اشتر جو ایک منجھا ہوا فدا کار اور اپنا سب کچھ قربان کردینے والا افسر تھا اسی طرح آگے بڑھتا جارہا تھا کہ تا کہ معاویہ کے خیمہ کو سرنگوں کیا جائے جہاں سے اس کی فوج کی کمان کی جارہی تھی اور اسلام کے راستے کو کانٹے سے پاک کرے اسی وقت اس گروہ نے علی علیہ السلام پر دباؤ ڈالا کہ پیچھے سے حملہ کردیں گے۔ علی علیہ السلام جتنا اصرار کرتے اتنا ہی ان کے انکار میں اضافہ ہوتا اور وہ پہلے سے زیادہ ضد کرتے۔ علی علیہ السلام نے مالک اشتر کو پیغام بھیجا کہ جنگ بند کردے اور خود میدان سے واپس آجائے۔

اس نے علی علیہ السلام کے پیغام کو جواب دیا کہ آپ مجھے چند لمحوں کی اجازت دیں تو جنت ختم ہے اور دشمن بھی نیست و نابود ہونے والا ہے۔

انہوں (خارجیوں) نے تلواریں نکالیں اور کہا کہ یا تو ہم تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے یا اس سے کہہ دو کہ واپس آجائے۔

آپ نے دوبارہ اس کو پیغام بھیجا کہ اگر تم علی علیہ السلام کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو جنگ روک دو اور واپس آجاؤ، وہ واپس آیا اور دشمن خوش ہو گیا کہ اس کا فریب خوب کارگر ہوا۔

جنگ روک دی گئی تا کہ قرآن کو حاکم قرار دیں، ثالثی کونسل تشکیل دیں اور دونوں طرف کے حکم قرآن وسنت میں طرفین کا جن باتوں پر اتفاق ہے ان کو رو سے فیصلہ کریں اور اختلافات کو ختم کریں یا ایک اور اختلاف کا اضافہ کریں اور حالات کو بد سے بدتر بنادیں۔

علی علیہ السلام نے کہا کہ وہ اپنے حکم کی تعیین کردیں تا کہ ہم بھی اپنا حکم معین کریں، انہوں نے تجویز پیش کی کہ عبداللہ ابن عباس جیسے سیاست دان، یا مرد فدا کار و روشن بین باایمان مالک اشتر یا اسی قبیل کے کسی شخص کو مقرر کیا جائے لیکن ان احمقوں کو اپنے جیسے کسی کی تلاش تھی، انہوں

نے ابوموسیٰ جیسے کو جو ایک ناسمجھ آدمی تھا اور جس کو علی علیہ السلام سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، منتخب کیا۔ ہر چند کہ علی علیہ السلام اور ان کے دوستوں نے ان لوگوں کو یہ واضح کرنا چاہا کہ یہ کام ابوموسیٰ کا نہیں ہے اور وہ اس مقام کا اہل نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے علاوہ ہم کسی اور پر اتفاق نہیں کرتے۔ علی علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو جو تم چاہو کرو۔

آخر کار انہوں نے اس کو علی علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے حکم کی حیثیت سے ثالثی کونسل میں بھیجا۔ مہینوں کے مشورے کے بعد عمرو عاص نے ابوموسیٰ سے کہا کہ مسلمانوں کے مفاد میں بہتر یہی ہے کہ نہ علی علیہ السلام ہو اور نہ معاویہ اور ہم کسی تیسرے شخص کو منتخب کریں اور وہ تمہارے داماد عبداللہ ابن عمر کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ابوموسیٰ نے کہا کہ تو نے سچ کہا ہے۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ کہا کہ تو علی علیہ السلام کو خلافت سے معزول کرے گا اور میں معاویہ کو، بعد میں جسے مسلمان چاہیں گے اور ایک مناسب آدمی کو جو لازماً عبداللہ ابن عمر ہی ہے، منتخب کریں گے اور یوں فتنے کی جڑ ختم کر دی جائے گی۔ اس بات پر دونوں نے اتفاق کیا اور اعلان کر دیا کہ لوگ حکمیت کا نتیجہ سننے کے لئے جمع ہو جائیں۔

لوگ جمع ہو گئے، ابوموسیٰ نے عمرو عاص سے کہا کہ منبر پر جا کر اپنے فیصلے کا اعلان کرے،

عمرو عاص سے کہا کہ میں؟ تم سفید ریش اور پیغمبر کے محترم صحابی ہو میں ہرگز یہ جسارت نہیں کر سکتا کہ تم سے پہلے کوئی بات کروں۔

ابوموسیٰ اپنی جگہ سے اٹھا اور منبر پر جا کر بیٹھ گیا۔

لوگوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، آنکھیں خیرہ ہونے اور سانسیں سینوں میں اٹکنے لگیں۔

سب کو یہ انتظار کہ کیا نتیجہ نکلے؟

اس نے بولنا شروع کیا کہ ہم نے مشورے کے بعد امت کا مفاد اس میں دیکھا کہ نہ

علی علیہ السلام ہو اور نہ معاویہ اور مسلمان خود جانتے ہیں وہ جس کو چاہیں منتخب کریں اور اپنی انگوٹھی کو دائیں ہاتھ سے نکالتے ہوئے کہا کہ میں نے علی علیہ السلام کو خلافت سے معزول کر دیا جس طرح میں نے اس انگوٹھی کو ہاتھ سے نکالا۔ یہ کہا اور منبر سے اتر آیا۔

عمر و عاص اٹھا اور منبر پر بیٹھ گیا اور کہا کہ تم لوگوں نے ابوموسیٰ کی باتیں سن لیں کہ اس نے علی علیہ السلام کو خلافت سے معزول کر دیا ہے میں بھی ان کو خلافت سے معزول کرتا ہوں جس طرح کہ ابوموسیٰ نے کیا ہے اور اپنی انگوٹھی کو اپنے دائیں ہاتھ سے باہر نکالا اس کے بعد اپنی انگوٹھی کو اپنے بائیں ہاتھ میں ڈالتے ہوئے کہا کہ میں معاویہ کو اس طرح خلافت پر نصب کرتا ہوں جس طرح اپنی انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں ڈالا ہے۔ یہ کہا اور منبر سے نیچے اترا۔

مجلس میں کھلبلی مچ گئی لوگوں نے ابوموسیٰ پر حملہ کرنا شروع کیا اور بعض لوگ تازیانہ لے کر اس کی طرف بڑھے، وہ مکہ کی طرف بھاگ گیا اور عمر و عاص بھی شام چلا گیا۔

خوارج نے جو اس معاملے کو پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے حکمیت کی رسوائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن وہ نہیں سمجھتے تھے کہ غلطی کہاں پر ہوئی ہے؟ وہ نہیں کہتے تھے کہ ہماری غلطی یہ تھی کہ ہم نے معاویہ اور عمر و عاص کی مکاری کو تسلیم کیا اور جنگ بند کر لی اور یہ بھی نہیں کہتے تھے کہ حکمیت کا فیصلہ ہو جانے کے بعد مصلح کے انتخاب میں ہم نے خطا کی کہ عمر و عاص کے مقابلے میں ابوموسیٰ کو مقرر کیا۔ بلکہ کہتے تھے کہ ہم نے دین خدا میں دو انسانوں کو حکم اور مصلح قرار دیا جو خلاف شرع اور کفر تھا۔ حاکم صرف خدا ہے نہ کہ انسان۔

وہ علی علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ ہم نے نہیں سمجھا ارو حکمیت کو تسلیم کیا تم بھی کافر ہو گئے اور ہم بھی، ہم نے توبہ کر لی ہے تم بھی توبہ کر لو۔ مصیبت تازہ ہو گئی اور بڑھ گئی۔

علی علیہ السلام نے کہا بہر حال توبہ کرنا اچھی بات ہے استغفر اللہ من کل ذنب ہم ہمیشہ ہر گناہ سے استغفار کرتے ہیں۔

انہوں نے کہا یہ کافی نہیں ہے بلکہ تم کو اعتراف کر لینا چاہیے کہ حکمیت گناہ تھی اور اس

گناہ سے توبہ کرو۔

کہا: ایک طرف تو تم نے خود تحکیم کا مسئلہ پیدا کیا ہے اور اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا ہے اور دوسری طرف سے جو چیز شریعت میں جائز ہے میں کس طرح اس کو گناہ قرار دوں اور جس گناہ کا میں مرتکب نہیں ہوا ہوں اس کا اعتراف کرلوں۔

یہاں سے انہوں نے ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ ابتداء میں ایک باغی اور سرکش گروہ تھا اسی لئے ان کا نام خوارج رکھ دیا گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے لئے اصول عقائد منظم کر لئے اور وہ گروہ جو ابتداء میں سیاسی شکل کا تھا رفتہ رفتہ ایک مذہبی فرقہ کی صورت اور مذہبی رنگ اختیار کر گیا۔

بعد میں خوارج نے ایک مذہب کے حامیوں کی حیثیت سے تیز تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور آہست آہستہ جب انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ اپنے خیال میں دنیائے اسلام کے مفاسد کی نشاندہی کریں، وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عثمان، علی علیہ السلام اور معاویہ سب غلطی پر اور گناہگار ہیں اور ہمیں چاہیے کہ جو مفاسد پیدا ہو گئے ہیں ان کا مقابلہ کریں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔

اس طرح خوارج کا مذہب امر بہ معروف اور نہی از منکر کے فریضے کے عنوان سے وجود میں آیا۔

امر بہ معروف اور نہی از منکر کا فریضہ سب سے پہلے دو اساسی شرطیں رکھتا ہے: ایک دینی بصیرت اور دوسرے عمل میں بصیرت۔

دین کی بصیرت جس طرح کہ روایت میں آیا ہے اگر نہ ہو تو اس کام کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔

جہاں تک عمل میں بصیرت کا تعلق ہے وہ ان دو شرطوں کا لازمہ ہے جن کو فقہ میں احتمال تأثیر اور عدم ترتب مفسدہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کا فائدہ تب ہے جب ان دو فریضوں کے

سلسلے میں عقل و منطق کو دخل ہو۔ [1]

---

[1] یعنی امر بہ معروف اور نہی از منکر اس لئے ہے کہ معروف،، رائج ہوجائے اور منکر،، مٹ جائے۔ پس امر بہ معروف اور نہی از منکر وہاں کیا جانا چاہیے کہ جہاں اس نتیجے کے مترتب ہونے کا احتمال ہو، اگر ہمیں معلوم ہو کہ قطعاً بے اثر ہے تو واجب کیونکر؟

اور دوسرے یہ کہ اس عمل کو شریعت نے اس لئے رکھا ہے کہ کوئی مصلحت انجام پائے اس لئے لازماً وہاں انجام پانا چاہیے کہ جہاں پہلے سے زیادہ خرابی پیدا نہ ہو۔ ان دو شرطوں کا لازمہ بصیرت در عمل ہے وہ شخص جس میں بصیرت در عمل مفقود ہے پیش بینی نہیں کر سکتا کہ اس کام کا کوئی نتیجہ نکلے گا یا نہیں اور یہ کہ کوئی پہلے سے زیادہ مفسدہ ہوگا یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ جاہلانہ امر بہ معروف، جس طرح کہ حدیث میں ہے، اس کا نقصان فائدے سے زیادہ ہے۔

تمام فرائض میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ احتمال ترتب فائدہ اس کی شرط ہے اور اگر فائدہ کا احتمال ہے تو انجام دیا جائے اور اگر فائدہ کا احتمال نہ ہو تو انجام دیا جائے حالانکہ ہر فریضہ میں کوئی فائدہ اور مصلحت پیش نظر ہے لیکن ان مصلحتوں کو پہچاننے کی ذمہ داری لوگوں پر نہیں ڈالی گئی ہے۔ نماز کے بارے میں نہیں کہا گیا ہے کہ اگر تم دیکھو کوئی فائدے کی صورت ہے تو پڑھو ورنہ نہ پڑھو، روزہ کے سلسلے میں بھی نہیں کہا گیا کہ اگر تمہیں فائدہ کا احتمال ہو تو رکھو ورنہ نہ رکھو۔ روزہ کے سلسے میں کہا گیا ہے کہ اگر تم دیکھ کہ نقصان یا ضرر کی صورت ہے تو نہ رکھو اسی طرح حج یا زکوٰۃ یا جہاد کے بارے میں اس طرح کی کوئی قید نہیں ہے لیکن امر بہ معروف اور نہی از منکر کے بارے میں یہ قید ہے کہ دیکھنا چاہیے کیا اثر اور کیا ردعمل رکھتا ہے اور یہ کہ کیا عمل اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں ہے یا نہیں؟ یعنی مصلحت کو پہچاننے کی ذمہ داری خود عمل کرنے والوں پر ڈالی گئی ہے۔

اس فریضے میں ہر شخص کو یہ حق ہے بلکہ واجب ہے کہ منطق اور عقل و بصیرت در عمل اور توجہ بہ فائدہ کو دخل دینے کا راستہ دے کیونکہ یہ عمل محض تعبدی نہیں ہے (گفتار ماہ جلد اول میں امر بہ معروف و نہی از منکر کے موضوع پر تقریر، کی طرف رجوع کیا جائے)

یہ شرط کہ امر بہ معروف اور نہی از منکر کے سلسلے میں عملی بصیرت سے کام لینا واجب ہے، اس پر خوارج کو چھوڑ کر باقی تمام اسلامی فرقوں کا اتفاق ہے۔ وہ اسی جمود، خشکی اور مخصوص تعصب کی بناء پر جو وہ رکھتے تھے، کہتے تھے کہ امر بہ معروف و نہی از منکر تعبد محض،، ہے اس میں احتمال اثر،، اور عدم ترتب مفسدہ،، کی کوئی شرط نہیں ہے اس لئے کسی کو بیٹھ کر اس کے نتائج کا حساب نہیں لگانا چاہیے۔ اپنے اسی عقیدے کی بناء پر یہ جانتے ہوئے کہ وہ مارے جائیں گے، ان کا خون بہایا جائے گا اور یہ جانتے ہوئے کہ ان کے قیام کا کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوگا، وہ قیام کرتے تھے اور یا دوسروں پر حملہ کرتے تھے۔

خوارج نہ بصیرت دینی رکھتے تھے اور نہ بصیرت عملی، وہ نادان اور بے بصیرت لوگ تھے۔ بلکہ بنیادی طور پر وہ عملی بصیرت کے منکر تھے کیونکہ وہ اس فریضے کو ایک امر تعبدی جانتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ آنکھیں بند کرے ے اس کو انجام دینا چاہیے۔

اصول عقائد خوارج

خارجیت کی بنیاد پر چند چیزوں سے تشکیل پائی تھی:

(۱) علی علیہ السلام، عثمان، معاویہ، اصحاب جمل اور اصحاب حکمیت اور ان تمام لوگوں جو حکمیت پر راضی ہوئے، کی تکفیر۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے حکمیت کا مشورہ دیا اور بعد میں توبہ کر لی۔

(۲) ان لوگوں کی تکفیر جو علی علیہ السلام وعثمان اور دوسرے لوگوں کے کفر کے قائل نہ ہوں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

(۳) صرف ایمان ولی عقیدہ نہیں ہے بلکہ اوامر پر عمل اور نواہی کو ترک کرنا بھی جزو ایمان ہے۔ ایمان، اعتقاد اور عمل سے مرکب ایک امر ہے۔

(۴) ایک ظالم امام اور حکمران کے خلاف غیر مشروط بغاوت کا وجوب۔

وہ کہتے تھے کہ امر بہ معروف اور نہی عن المنکر کے لئے کسی چیز کی شرط نہیں ہے اور ہر جگہ بغیر کسی استثناء کے اس حکم الٰہی کو انجام دیا جانا چاہیے۔ [۱]

ان عقائد کی وجہ سے انہوں نے ایسے عالم میں سحر کی کہ روئے زمین کے تمام لوگوں کو کافر، واجب القتل اور ابدی جہنمی سمجھتے تھے۔

---

[۱] ضحیٰ الاسلام ج ۳ ص ۳۳۰ منقول از کتاب الفرق بین الفرق

خلافت کے بارے میں خوارج کا عقیدہ

خوارج کی واحد فکر جو آج کے تجدّد پسندوں کی نظر میں درخشاں ظاہر کی جاتی ہے وہ خلافت آزادانہ انتخاب کے ذریعہ ہونی چاہیے اور موزوں ترین شخص وہ ہے جو ایمان وتقویٰ کے لحاظ سے صلاحیت رکھتا ہو خواہ قریش سے ہو یا غیر قریش سے، ممتاز قبیلے سے ہو یا گمنام اور پسماندہ قبیلے سے۔ عرب ہو یا غیر عرب۔

انتخاب اور بیعت مکمل ہونے کے بعد خلیفہ اگر اسلامی معاشرے کے مفاد کے خلاف چلے تو وہ خلافت سے معزول ہو جاتا ہے اور اگر وہ (معزول ہونے سے) انکار کر بیٹھے تو اس سے جنگ کرنا چاہیے یہاں تک کہ وہ مارا جائے۔ [۱]

یہ لوگ خلافت کے بارے میں شیعوں کے مخالف قرار پائے ہیں جو کہتے ہیں کہ خلافت ایک امر الٰہی ہے اور خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف خدا کی طرف سے معین کیا گیا ہو اور اسی طرح سنیوں کے بھی مخالف ہیں جو کہتے ہیں کہ خلافت صرف قریش کے لئے ہے اور "انما الائمۃ من القریش" کے جملے سے وابستگی ڈھونڈھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ خلافت کے بارے میں ان کا یہ نظریہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جس تک وہ اپنی پیدائش کے ساتھ ہی پہنچے ہوں۔ بلکہ جیسا کہ ان کا مشہور نعرہ لاحکم الا اللہ حکایت کرتا ہے اور نہج البلاغہ [۲] سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں وہ کہتے تھے کہ افراد اور معاشرے کو کسی امام یا حکومت

---

[۱] ضحیٰ الاسلام ج ۳، ص ۳۳۲

[۲] خطبہ ۴۰ وشرح ابن ابی الحدید ج ۲، ص ۳۰۸

کی ضرورت نہیں ہے اور لوگوں کو خود خدا کی کتاب پر عمل کرنا چاہیے۔

لیکن بعد میں وہ اس عقیدے سے پھر گئے اور خود عبداللہ بن وہب راسبی کی بیعت کرلی۔[1]

[1] کامل ابن اثیر ج ۳، ص ۳۳۶

خلفاء کے بارے میں خوارج کا عقیدہ

وہ ابوبکر اور عمر کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے اس اعتبار سے کہ یہ دونوں ایک صحیح انتخاب کے ذریعے خلافت تک پہنچے تھے اور مصالح کی راہ سے بھی منحرف نہیں ہوئے اور اس کے خلاف کسی چیز کے مرتکب نہیں ہوئے۔ وہ عثمان اور علی علیہ السلام کے انتخاب کو بھی صحیح جانتے تھے۔ بالآخر کہتے تھے کہ عثمان اپنی خلافت کے چھٹے سال کے آخر میں راہ سے منحرف ہو گیا ہے اور مسلمانوں کے مفادات سے آنکھیں پھیر لی ہیں اس لئے وہ خلافت سے معزول تھا اور چونکہ مسئلہ تحکیم کو قبول کیا اور اس کے بعد توبہ نہیں کی ہے وہ بھی کافر ہو گیا اور واجب القتل تھا اور اس لئے ساتویں سال کے بعد عثمان کی خلافت اور تحکیم کے بعد علی علیہ السلام کی خلافت سے تبّریٰ (بیزاری کا اظہار) کرتے تھے۔[1] وہ سارے خلفاء سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے اور ہمیشہ ان کے ساتھ برسرپیکار رہتے تھے۔

---

[1] الملل والنحل شہرستانی

خوارج کا خاتمہ

یہ گروہ پہلی صدی ہجری کے چوتھے دہائی کے اواخر میں ایک خطرناک فریب کے نتیجے میں وجود میں آیا اور ڈیڑھ صدی سے زیادہ نہ ٹھہر سکا۔ اپنے بے جا جوش اور جنون آمیز بے باکیوں کی وجہ سے وہ خلفاء کی سرزنش کا شکار بنے جنہوں نے ان کو اور ان کے مذہب کو تباہی و بربادی کی طرف دھکیلا اور عباسی سلطنت کے قیام کے اوائل میں سرے سے نابود ہو گئے۔ ان کی خشک اور بے روح منطق، ان کو وہ روش جو زندگی سے نا آہنگ تھی اور سب سے بڑھ کر ان کے بیجا جوش نے جس کی وجہ سے انہوں نے تقیّہ کے صحیح اور منطقی مفہوم تک سے کنارہ کشی اختیار کی، ان کو نابود کر دیا۔ خوارج کا مکتب کوئی ایسا مکتب نہ تھا جو واقعاً باقی رہ سکتا لیکن اس مکتب نے اپنا اثر باقی رکھا۔ خارجیت کے افکار و عقائد نے تمام اسلامی فرقوں میں نفوذ پیدا کیا اور اب بھی بہت سے نہروانی موجود ہیں اور علی علیہ السلام کے عہد و عصر کی طرح اسلام کے خطرناک ترین داخلی دشمن یہی لوگ ہیں۔ جس طرح کہ معاویہ اور عمرو عاص بھی ہر دور میں رہے ہیں اور نہروانیوں کے وجود سے جو ان کے دشمن شمار ہوتے ہیں، موقعہ پر فائدہ اٹھاتے ہیں۔

رسوم یا روح

ایک مذہبی بحث کی حیثیت سے خارجیت یا خوارج کے اوپر بحث کرنا، کسی مورد کے بغیر بحث اور بے نتیجہ ہے کیونکہ آج دنیا میں ایسا کوئی مذہب وجود نہیں رکھتا لیکن اس کے ساتھ ہی خوارج اور ان کے کام کی نوعیت کے بارے میں بحث ہمارے اور ہمارے معاشرے کے لئے سبق آموز ہے کیونکہ ہر چند خوارج کا مذہب ختم ہو چکا ہے لیکن اس کی روح ابھی زندہ ہے۔ خارجیت کی روح ہم میں سے بہت سے لوگوں کے پیکر میں حلول کئے ہوئے ہے۔ لازم ہے کہ مقدمے کے طور پر کچھ کہوں:

یہ ممکن ہے کہ کچھ مذاہب رسوم کے اعتبار سے مر چکے ہوں لیکن اپنی روح کے اعتبار سے زندہ ہوں جیسا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے برعکس ہو کہ کوئی مسلک رسوم کے اعتبار سے زندہ ہو لیکن روح کے اعتبار سے کلی طور پر مر چکا ہو لہٰذا ممکن ہے کہ کوئی فرد یا کچھ افراد رسوم کے لحاظ سے ایک مذہب کے تابع اور پیرو شمار کئے جاتے ہوں اور روح کے اعتبار سے اس مذہب کے پیرو نہ ہوں اور اس کے برعکس ممکن ہے کہ بعض روح کے اعتبار سے کسی مذہب کے پیرو ہوں حالانکہ اس مذہب کے رسوم کو انہوں نے قبول نہ کیا ہو۔

مثلاً جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ابتداء ہی مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے :۔ سُنّی اور شیعہ۔ سُنّی ایک رسم اور عقیدے کے چوکھٹے کے اندر ہیں اور شیعہ دوسرے رسم اور عقیدے کی چار دیواری کے اندر۔

شیعہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے خلیفۂ بلافصل علی علیہ السلام ہیں اور آنحضرت نے علی علیہ السلام کو خدا

کے حکم سے اپنی خلافت اور جانشینی کے لئے معین کیا ہے اور پیغمبر کے بعد یہ مقام ان کے لئے مخصوص ہے اور اہل سنت کہتے ہیں کہ اسلام نے اپنا قانون بناتے ہوئے خلافت و امامت کے موضوع میں کوئی مخصوص پیش بینی نہیں کی ہے بلکہ رہبر کے انتخاب کا معاملہ خود لوگوں پر چھوڑا ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ قریش کے درمیان سے منتخب کیا جائے۔

شیعہ پیغمبر کے بہت سے ایسے صحابہ پر تنقید کرتے ہیں جن کا شمار اکابر اور مشہور شخصیتوں میں ہوتا ہے اور سنی اس معاملے شیعوں کے بالکل مخالف ہیں وہ ہر اس شخص کے بارے میں بہت زیادہ اور عجیب خوش بینی رکھتے ہیں، جو صحابی کہلاتا ہو۔ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے تمام صحابہ عادل اور صحیح کام کرنے والے ہیں۔ تشیع کی بنیاد تنقید، تحقیق، ناخوش عقیدگی اور بال کی کھال اتارنا ہے اور تسنن کی بنیاد "حمل بر صحت"، "توجیہ" اور "انشاء اللہ سب صحیح ہیں" پر ہے۔

اس عصر اور زمانے میں جس میں ہم ہیں۔ کافی ہے کہ جو شخص کہہ دے: علی علیہ السلام پیغمبر کے خلیفۂ بلافصل ہیں ہم اس کو شیعہ سمجھیں اور اس سے کسی اور چیز کی توقع نہ رکھتے ہوں؟ وہ جس بھی روح اور جس نوعیت کے طرز فکر کا ہو، ہوا کرے؟

لیکن اگر ہم صدر اسلام کی طرف مڑ کر دیکھیں تو ہمیں ایک خاص قسم کا جذبہ نظر آتا ہے کہ وہ جذبہ تشیع کا جذبہ ہے اور وہی جذبات تھے جو علی علیہ السلام کے بارے میں پیغمبر کی وصیت کو سو فیصد قبول کر سکتے تھے اور کسی قسم کے شک اور تذبذب کا شکار نہ ہوتے تھے جس جذبہ اور اس طرز فکر کے مقابلے میں ایک اور جذبہ اور طرز فکر تھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل ایمان رکھنے کے باوجود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیتوں کی ایسی توجیہ اور تفسیر اور تاویل کرتے تھے جو مطلوب نہ تھی اور در حقیقت اسلام میں انتشار یہاں سے پیدا ہوا کہ ایک گروہ جس کی یقیناً اکثریت تھی صرف ظاہر کو دیکھتا تھا اور ان کی نظر اتنی تیز اور گہری نہ تھی کہ ہر واقعہ کی حقیقت اور اس کے باطن کو بھی دیکھتی وہ ظاہر کو دیکھتا اور ہر جگہ حمل بر صحت کرتا تھا وہ لوگ کہتے کہ بزرگ، بوڑھے اور اسلام میں پہل کرنے والے صحابہ ایک راہ پر چلے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے غلطی کی ہے

لیکن دوسرا گروہ جو اقلیت میں تھا وہ اسی وقت سے کہتا رہا ہے کہ شخصیتیں اس وقت تک ہمارے نزدیک قابل احترام ہیں جب تک وہ حقیقت کا احترام کرتی رہیں لیکن جہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے اصول انہی پہل کرنے والوں کے ہاتھوں پائمال ہو رہے ہیں، پھر ان کا کوئی احترام نہیں ہے۔ ہم اصول کے طرفدار ہیں نہ کہ شخصیتوں کے۔ اس روح کے ساتھ تشیع وجود میں آیا ہے۔

ہم جب تاریخ میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، مقداد کندی رضی اللہ عنہ، عمار یاسر رضی اللہ عنہ اور اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دیکھیں کہ ان لوگوں کو علی علیہ السلام کے گرد جمع ہونے اور اکثریت کو چھوڑ دینے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایسے لوگ تھے جو اصولی بھی تھے اور اصول شناس بھی، دیندار بھی تھے اور دین شناس بھی، وہ کہتے تھے کہ ہمیں اپنی فکر وادراک کو دوسروں کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہیے اور یہ کہ جب وہ غلطی کریں تو ہم بھی غلطی کریں اور درحقیقت ان کی روح ایسی روح تھی جن پر اصول اور حقائق کی حکمرانی تھی نہ کہ اشخاص اور شخصیتوں کی!

امیر المومنین علیہ السلام کے صحابہ میں سے ایک شخص جنگ جمل کے معاملے میں سخت تردد کا شکار تھا۔ وہ دونوں طرف دیکھتا ایک طرف علی علیہ السلام کو دیکھتا تھا اور ان بزرگ مسلمان شخصیتوں کو جو علی علیہ السلام کے ہمرکاب ہو کر تلواریں کھینچے ہوئے تھیں اور دوسری طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی حضرت عائشہ کو دیکھتا کہ قرآن، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کے بارے میں کہتا ہے:

وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ [1]

اس کی بیویاں امت کی مائیں ہیں

اور عائشہ کے ہمرکاب طلحہ کو دیکھتا جو سابقین میں سے تھا ایک اچھا ماضی رکھنے والا، تیز انداز اور اسلامی جنگوں کا ماہر سپاہی، ایسا شخص جس نے اسلام کی بیش بہا خدمت کی ہے اور پھر

---

[1] سورۂ احزاب آیت ٦

زبیر کو دیکھتا جو طلحہ سے بھی اچھا ماضی رکھنے والا حتیٰ کہ وہ ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے سقیفہ کے روز علی علیہ السلام کے گھر پناہ لی تھی۔

یہ شخص عجیب حیرت میں پڑا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ آخر علی علیہ السلام و طلحہ اور زبیر اسلام میں پہل کرنے والوں اور اسلام کے سخت ترین فداکاروں میں سے ہیں، اب وہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں؟! ان میں کون زیادہ حق کے قریب ہے؟ اس الجھن میں کیا کرنا چاہئے؟

یاد رکھیے! اس حیران شخص کی زیادہ ملامت نہیں کرنی چاہیے۔ شاید اگر ہم بھی ان حالات سے دوچار ہوتے جن میں وہ دو چار ہوا تو زبیر اور طلحہ کی شخصیت اور خدمات ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیتیں۔

آج جب ہم علی علیہ السلام و عمار و اویس قرنی اور دوسرے لوگوں کو۔۔۔ زبیر و طلحہ کے بالمقابل دیکھتے ہیں تو تردد کا شکار نہیں ہوتے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرے گروہ کے لوگوں کی پیشانی سے جنایت ٹپکتی ہے یعنی ان کے چہرے سے جرم اور خیانت کے آثار ظاہر ہیں اور ان کے قیافہ اور چہروں کو دیکھنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ دوزخ والے ہیں لیکن اگر ہم اس زمانے میں ہوتے اور ان کی خدمات کو نزدیک سے دیکھتے تو شاید تردد سے محفوظ نہ رہ سکتے۔

آج جب ہم پہلے گروہ کو برحق اور دوسرے گروہ کو باطل پر جانتے ہیں وہ اس اعتبار سے ہے کہ گذشتہ تاریخ کے نتیجے میں اور حقائق کے روشن ہونے کی وجہ سے ایک طرف علی علیہ السلام اور عمار اور دوسری طرف زبیر اور طلحہ کو ہم نے پہچان لیا ہے اور ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ اس بارے میں صحیح فیصلہ کریں یا کم از کم اگر ہم خود تاریخ میں تحقیق اور مطالعہ کے اہل نہیں تو بچپنے سے ہمیں اسی طرح سمجھایا گیا ہے لیکن ان دنوں ان دو اسباب میں کوئی ایک بھی وجود نہیں رکھتا تھا۔

بہر حال وہ شخص امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا اور کہا:

"أیمکن ان یجتمع زبیر و طلحة و عائشة علی باطل"۔

کیا ممکن ہے کہ طلحہ و زبیر اور عائشہ باطل پر اجماع کر لیں؟

ان جیسی شخصیتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بزرگ صحابہ کس طرح غلطی کر سکتے اور باطل کی راہ پر چل سکتے ہیں کیا یہ ممکن ہے؟

علی علیہ السلام جواب میں ایسی بات کرتے ہیں کہ مصر کے دانشور اور ادیب ڈاکٹر طہٰ حسین کہتے ہیں:

اس سے زیادہ محکم اور بالاتر بات نہیں ہو سکتی، وحی کے خاموش ہونے اور ندائے آسمانی کے منقطع ہونے کے بعد اتنی عظیم بات نہیں سنی گئی ہے۔ [۱]

فرمایا:

فَذَكِّرْ فَإِنَّكَ امْرُؤٌ مَلْبُوسٌ عَلَيْكَ إِنَّ دِينَ اللهِ لَا يُعْرَفُ بِالرِّجَالِ بَلْ بِآيَةِ الْحَقِّ وَ الْآيَةُ الْعَلَامَةُ فَاعْرِفِ الْحَقَّ تَعْرِفْ أَهْلَهُ. [۲]

توجہ کرو کہ تم دھوکا کھائے ہوئے ہو اور حقیقت کی پہچان میں تم سے غلطی ہوئی ہے۔ حق و باطل کو افراد کی شخصیت اور قدر و قیمت کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ تم پہلے شخصیات کو پیمانہ قرار دو اور اس کے بعد حق و باطل کو ان پیمانوں سے پرکھو۔

فلاں چیز حق ہے کیونکہ فلاں اس کے ساتھ موافق ہیں اور فلاں چیز باطل کیونکہ فلاں فلاں اس کے مخالف ہیں۔ نہیں، اشخاص کو حق و باطل کا پیمانہ نہیں بنایا جانا چاہیے بلکہ حق و باطل کو اشخاص اور ان کی شخصیت کا پیمانہ قرار دیا جانا چاہیے۔

یعنی تمہیں چاہیے کہ حق شناس اور باطل شناس بنو نہ کہ اشخاص و شخصیت شناس۔ افراد کو خواہ بڑی شخصیات ہوں یا چھوٹی شخصیات حق کے معیار پر پرکھو اگر اس کے اوپر پورا اتریں تو ان

---

[۱] علی و نبوہ ص ٤٠

[۲] بحار الأنوار (ط-بيروت) / ج27 / 160 / باب 6 ما ينفع حبهم فيه من المواطن و أنهم عليهم السلام يحضرون عند الموت و غيره و أنه يسأل عن ولايتهم في القبر ..... ص: 157

کی شخصیت کو قبول کر و ورنہ نہیں۔ یہ کوئی بات نہیں ہے کہ آیا طلحہ وزبیر و عائشہ کے لئے ممکن ہے کہ باطل پر ہوں؟

یہاں علی علیہ السلام نے خود حقیقت کو حقیقت کا معیار قرار دیا ہے اور روح تشیّع بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور در حقیقت شیعہ فرقہ ایک مخصوص نظر کی پیداوار ہے جو اسلامی اصول کو اہمیت دینے سے عبارت ہے نہ کہ افراد اور اشخاص کو۔ یوں لازمی طور پر ابتداء شیعہ تنقید کرنے اور (شخصیت کے) بُت توڑنے والوں کی حیثیت سے ابھرے۔

پیغمبر کے بعد تینتیس (۳۳) سالہ جوان علی علیہ السلام کے ساتھ انگلیوں کی تعداد سے کمتر اقلیت تھی اور ان کے مقابلے میں ساٹھ سالہ بوڑھے جن کے ساتھ بہت زبردست اکثریت تھی۔ اکثریت کی منطق یہ تھی کہ بزرگوں او مشائخ کا راستہ یہ ہے اور بزرگ غلطی نہیں کرتے اور ہم ان کی راہ پر چلتے ہیں۔ اُس اقلیت کی منطق یہ تھی کہ صرف یہ حقیقت ہی ہے جو غلطی نہیں کرتی، بزرگوں کو چاہئے کہ خود کو حقیقت کے ساتھ تطبیق کریں۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ کتنے زیادہ ہیں جو رسوم کے اعتبار سے شیعہ ہیں لیکن ان میں شیعیت کی روح نہیں ہے۔

تشیّع کی راہ اس کی روح کی طرح حقیقت کی تشخیص اور اس کی پیروی ہے اور اس کا سب سے بڑا اثر جذب اور دفع ہیں۔ لیکن ہر جذب اور ہر دفع نہیں جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کبھی جذب، باطل، ظلم اور ظالم کا جذب ہے اور دفع، حقیقت اور انسانی فضائل کا دفع، بلکہ وہ جذب اور دفع جو علی علیہ السلام کے جاذبہ و دافعہ کی قسم سے ہوں۔ شیعہ یعنی علی علیہ السلام کی سیرت کا نمونہ۔ شیعہ کے لئے بھی ضروری ہے کہ علی علیہ السلام کی طرح دوہری قوّت رکھتا ہے۔

یہ مقدّمہ اس لئے تھا کہ ہم یہ جان لیں کہ ممکن ہے ایک مذہب مر چکا ہو لیکن اس مذہب کی روح دوسرے لوگوں میں جو بظاہر اس مذہب کے پیرو نہ ہوں، بلکہ اپنے کو اُس مذہب کے مخالف سمجھتے ہوں، زندہ ہو۔ خوارج کا مذہب مر چکا ہے، یعنی آج روئے زمین پر کوئی قابل توجہ گروہ خوارج کے نام سے موجود نہیں ہے جو اسی نام سے اس کی پیروی کرتا ہو لیکن کیا مذہب

خارجی کی روح بھی مر چکی ہے؟ کیا اس روح نے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں حلول نہیں کیا ہے؟ آیا مثلاً خدانخواستہ ہمارے درمیان خاص کو اصطلاح میں ہمارے مقدس مآب طبقہ کے درمیان اس روح نے حلول نہیں کیا ہے؟

یہ ایسے موضوع ہیں جن پر علیٰحدہ غور و فکر کیا جانا چاہیے۔ اگر ہم مذہبِ خارجی کو صحیح طور پر پہچان لیں تو شاید اس سوال کا جواب دے سکیں۔ خوارج کے بارے میں بحث کی افادیت صرف اسی نقطۂ نظر سے ہے۔ ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ علی علیہ السلام نے ان کو کیوں دفع کیا یعنی علی علیہ السلام کے جاذبہ نے ان کو نہ کھینچا اور اس کے برعکس، اُن کے دافعہ نے ان کو دفع کر دیا؟

یہ بات مسلّم ہے جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے کہ خوارج کی شخصیت اور ان کی جبلّت کی تشکیل میں اثر انداز ہونے والے تمام عناصر ایسے نہ تھے کہ علی علیہ السلام کے دافعہ کے دائرۂ اثر میں قرار پاتے۔ بلکہ ان کی جبلت میں ایسی خصوصیات اور روشن امتیازات بھی موجود تھے کہ اگر ان کے ساتھ تاریک پہلوؤں کا ایک سلسلہ نہ ہوتا تو وہ علی علیہ السلام کے جاذبہ کے زیر اثر قرار پاتے۔ لیکن ان کی جبلّت کے تاریک پہلو اتنے زیادہ تھے کہ جنہوں نے ان کو علی علیہ السلام کے دشمنوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

علی علیہ السلام کی جمہوریت

امیر المومنین علیہ السلام نے خوارج کے ساتھ انتہائی آزادی اور جمہوری رویہ روا رکھا۔ یہ خلیفہ تھے اور وہ ان کی رعایا، ہر قسم کا سیاسی ایکشن ان کے بس میں تھا لیکن انہوں نے ان کو قید نہیں کیا ان کو کوڑے نہیں مارے اور حتیٰ کہ بیت المال سے ان کا وظیفہ بھی بند نہیں کیا اور ان کو باقی لوگوں کے ساتھ ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ مثال علی علیہ السلام کی زندگی کی تاریخ میں انوکھی نہیں ہے تاہم دنیا میں اس کی مثال بہت اہم ہے۔ وہ ہر جگہ اپنے عقیدے کے اظہار میں آزاد تھے حضرت خود اور ان کے اصحاب آزاد عقیدے کے ساتھ اُن کے روبرو ہوتے اور گفتگو کرتے تھے۔ طرفین استدلال کرتے تھے ایک دوسرے کے استدلال کا جواب دیتے تھے۔ شاید اس قدر آزادی کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ہے کہ ایک حکومت نے اپنے مخالفین کے ساتھ اس حد تک جمہوری روّیہ روا رکھا ہو۔ وہ مسجد میں آتے اور علی علیہ السلام کی تقریریوں اور ان کے خطبوں میں مداخلت کرتے۔ ایک دن امیر المومنین علیہ السلام منبر پر تھے ایک شخص آیا اور کوئی سوال کیا، علی علیہ السلام نے فی البدیہ جواب دیا۔ لوگوں کے درمیان سے ایک خارجی پکار اٹھا:

قاتله الله ما افقهه

خدا اس کو ہلاک کرے کتنا عالم ہے۔

اور لوگوں نے اس کے ساتھ نمٹنا چاہا لیکن علی علیہ السلام نے فرمایا اس کو چھوڑ دو اس نے صرف مجھے گالی دی ہے۔

خارجی نماز جماعت میں علی علیہ السلام کی اقتداء نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ انہیں کافر سمجھتے تھے، مسجد میں آتے تھے اور علی علیہ السلام کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تھے اور یوں ان کو آزار پہنچاتے تھے۔ ایک روز جبکہ علی علیہ السلام نے نماز میں کھڑے ہیں اور لوگ ان کی اقتداء کر رہے ہیں، ابن الکواء نامی ایک خارجی کی آواز بلند ہوئی اور علی علیہ السلام کی طرف کنایۃً ایک آیت زور سے پڑھی:

وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ [1]

بیشک آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف بھی وحی کی جا چکی ہے اور ان (انبیاء کی طرف بھی جو آپ سے پہلے تھے کہ اگر (بفرضِ محال) آپ نے بھی شرک کیا تو آپ کے عمل ضائع ہو جائیں گے اور آپ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

یہ آیت پیغمبر سے خطاب ہے کہ تم اور تم سے پہلے پیغمبروں پر وحی ہوئی کہ اگر مشرک ہو جاؤ تو تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گے۔ ابن الکواء اس آیت کو پڑھ کر علی علیہ السلام کو یہ جتانا چاہتا تھا کہ اسلام کے لئے تمہاری خدمات کو جانتے ہیں، تم سب سے پہلے مسلمان ہوئے ہو، پیغمبر نے تمہیں اپنی برادری کے لئے منتخب کیا ہے، شب ہجرت تم نے درخشاں فداکاری کی اور پیغمبر کے بستر پر سوئے، اپنے آپ کو تلواروں کے منہ میں دے دیا اور بالآخر اسلام کے لئے تمہاری خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن خدا نے اپنے پیغمبر سے یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم مشرک ہو جاؤ تو تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور چونکہ اب تم کافر ہو گئے ہو اس لئے تم نے اپنے گذشتہ اعمال کو ضائع کر دیا ہے۔

علی علیہ السلام نے اس کے جواب میں کیا کیا؟ جب تک اسکے قرآن پڑھنے کی آواز بلند رہی آپ خاموش رہے یہاں تک کہ اس نے آیت ختم کر لی جونہی اس نے آیت ختم کی علی علیہ السلام نے اپنی نماز جاری رکھی۔ ابن الکواء نے دوبارہ آیت کو دہرایا اور علی علیہ السلام نے فوراً خاموشی اختیار

---

[1] سورۂ زمر: ۶۵

کر لی۔علی علیہ السلام سکوت اس لئے اختیار کرتے تھے چونکہ قرآن کا حکم یہ ہے کہ:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ.[۱]

اور (اے مسلمانو) جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر (توجہ سے) سنو اور خاموش ہو جاؤ تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔

اور اسی لئے ہے کہ جب امام قرأت میں مشغول ہو ماموین کو چاہئے کہ خاموش رہیں اور سنیں۔

جب وہ کئی بار اس آیت کو دہرا چکا اور چاہا کہ نماز کی حالت کو برہم کرے اس کے بعد علی علیہ السلام نے یہ آیت پڑھی:

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ.[۲]

صبر کرو خدا کا وعدہ سچا ہے اور پورا ہو گا یہ ایمان ویقین سے بے بہرہ لوگ تمہیں نہیں ڈرا سکتے اور نہ تمہارے عزم کو کمزور کر سکتے ہیں۔

پھر آپ نے کوئی پرواہ نہ کی اور نماز جاری رکھی۔[۳]

---

[۱] سورۂ اعراف: ۲۰۴

[۲] سورۂ روم: ۶۰

[۳] ابن ابی الحدید ج ۲، ص ۳۱۱

خوارج کی بغاوت اور سرکشی

ابتداء میں خارجی پرامن تھے اور صرف تنقید اور کھلی بحث اپر اکتفا کرتے تھے، علی علیہ السلام کا رویہ بھی ان کے ساتھ ویسا ہی تھا جیسا کہ ہم نے پہلے کہا یعنی کسی لحاظ سے ان کی راہ نہ روکتے یہاں تک کہ بیت المال سے ان کے وظیفے بھی بند نہ کئے لیکن جوں جوں وہ علی علیہ السلام کے توبہ کرنے کی طرف سے مایوس ہوتے گئے، انہوں نے اپنا رویہ بدل ڈالا اور انقلاب برپا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اپنے ایک ہم مسلک کے گھر میں جمع ہوگئے اور ان میں سے ایک نے پرجوش اور اشتعال انگیز تقریر کی اور اپنے دوستوں کو امر بالمعروف اور نہی المنکر کے نام پر بغاوت اور سرکشی کی دعوت دی ان سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا:

اما بعد فو اللہ ما ینبغی لقوم یومنون بالرحمٰن و ینیبون الی حکم القرآن ان تکون ھذی الدنیا آثر عندھم من الامر بالعروف و النھی عن المنکر و القول بالحق و ان من و ضر فانہ من یمن و یضر فی ھذہ الدنیا فانّ ثوابہ یوم القیٰمۃ رضوان اللہ و الخلود فی جنانہ فالخرجوا بنا أخواننا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا الی کور الجبال او الیٰ بعض ھذہ المدائن منکرین لھٰذہ البدع المضلّۃ۔[1]

حمد وثنا کے بعد! خدا کی قسم مناسب نہیں ہے کہ وہ گروہ جو بخشنے والے خدا پر ایمان رکھتا

---

[1] الامامۃ والسیّاستہ ص ۱۴۱، ۱۴۳ وکامل مبرّد ج ۲

ہواور قرآن کے حکم پر چلتا ہو، اس کی نظر میں امر بہ معروف اور نہی از منکر اور سچّی بات سے زیادہ، دنیا محبوب ہو، اگر چہ یہ نقصان پہنچانے اور خطرہ پیدا کرنے والی چیزیں کیوں نہ ہوں کیونکہ اس دنیا میں جو بھی خطرہ اور نقصان میں رہا، اس کی جزا قیامت میں حق کی رضا مندی اور ہمیشہ کی بہشت ہے۔ بھائیو! ہم کو اس شہر سے باہر نکالو جس کے رہنے والے ظالم ہیں، پہاڑی مقامات کی طرف یا کسی اور شہر کی طرف تا کہ ان گمراہ کن بدعتوں کے خلاف ہم جہاد کر سکیں اور ان سے اپنا دامن بچائیں۔

ان باتوں سے ان کے مشتعل جذبات اور بھڑک اٹھے، وہاں سے اٹھے۔ سرکشی اور انقلاب شروع کر دیا۔ راستوں کا امن و امان سلب کر لیا اور لوٹ مار اور دہشت کو اپنا پیشہ بنالیا۔(۲) وہ چاہتے تھے کہ اس طرح حکومت کو کمزور کریں اور حکومت وقت کا تختہ الٹ دیں۔

یہ درگذر اور آزاد چھوڑ دینے کا مقام نہ تھا اب یہ اظہار عقیدہ کا مسئلہ نہ تھا بلکہ امن عامہ میں رخنہ ڈالنے کی کوشش اور شرعی حکومت کے خلاف مسلّح بغاوت تھی، اس لئے علی علیہ السلام نے ان کا پیچھا کیا اور نہروان کے مقام پر ان کے ساتھ آمنا ہوا۔ خطبہ پڑھا، نصیحت کی اور اتمام حجت کیا۔ پھر امان کا پرچم ابوایّوب انصاری کے ہاتھ میں دیا کہ جو بھی اس کے سائے میں آجائے اس کے لئے پناہ ہے۔ بارہ ہزار میں سے آٹھ ہزار واپس آئے۔ باقیوں نے مزاحمت کی اور بُری طرح شکست کھائی اور چند ایک کے سوا ان میں سے کوئی باقی نہ بچا۔

خوارج کی نمایاں خصوصیّات

خوارج کی ذہنیت ایک مخصوص ذہنیت ہے وہ لوگ اچھائی اور برائی کا مرکّب تھے اور مجموعی طور پر اس طرح کے لوگ تھے کہ بالآخر علی علیہ السلام کے دشمنوں کی صف میں قرار پائے اور علی علیہ السلام کی شخصیت نے ان کو دفع کیا جذب نہیں۔ ہم ان کی ذہنیت کے مثبت اور خوشگوار اور منفی و ناخوشگوار دونوں پہلوؤں اور مجموعی طور پر ان کی خطرناک بلکہ وحشت ناک فطرت کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) وہ مجاہدانہ اور فداکارانہ ذہنیت رکھتے تھے اور اپنے عقیدہ اور نظریے کی راہ میں جان توڑ کوشش کرتے تھے۔ خوارج کی تاریخ میں ہم ایسی فداکاریاں دیکھتے ہیں جن کی نظیر انسانی زندگی کی تاریخ میں کم ہے اور اس فداکاری اور جذبۂ قربانی نے اس کو دلیر اور طاقتور بنا دیا تھا۔ ابن عبد ربّہ ان کے بارے میں کہتا ہے:

ولیس فی الافراق کلها اشد بصائر من الخوارج، ولا اشد اجتهاداً، ولا أوطن انفسا علی الموت۔ منهم الّذی طعن فانقده الرمح فجعل یسعیٰ الی قاتله ویقول: ورب لترضیٰ. [۱]

تمام فرقوں میں خوارج سے زیادہ عقیدہ میں پختہ اور کوشش کرنے والا کوئی نہ تھا اور ان سے زیادہ موت کے لئے آمادہ کوئی پایا نہیں جاتا تھا۔ ان میں سے ایک کے نیزہ لگا تھا اور نیزہ

[۱] فجر الاسلام ص ۲۶۳ بہ نقل از العقد الفرید

سخت کاری لگا تھا، پھر بھی وہ اپنے قاتل کی طرف بڑھتا تھا اور کہتا تھا خدایا! میں تیری طرف بڑھ رہا ہوں تا کہ تو خوش ہو۔

معاویہ نے ایک شخص کو اس کے بیٹے کے پیچھے بھیجا جو خارجی تھا، تا کہ اسے واپس لائے۔لیکن باپ اپنے بیٹے کو اس کے فیصلے سے نہیں پلٹا سکا۔آخر اس نے کہا میرے بیٹے! میں جا کر تیرے نوعمر بچے کو لاؤں گا تا کہ تو اسے دیکھے اور تیری محبت پدری بیدار ہو اور تو دست بردار ہو۔اس نے کہا خدا کی قسم میں اپنے بیٹے سے زیادہ ایک کاری زخم کا مشتاق ہوں۔ [۱]

(۲) وہ عبادت گذار اور پرہیز گار لوگ تھے۔راتیں عبادت میں گزارتے تھے۔دنیا اور اس کی زیب وزینت سے کوئی رغبت نہ تھی۔جب علی علیہ السلام نے ابن عباس کو اصحاب نہروان کی طرف بھیجا کہ وہ پند ونصیحت کرے۔ابن عباس نے واپس آکر ان کی اس طرح توصیف کی:

لهم جباه قرحة لطول السجود وايد كثفنات الابل عليهم قمص مرحضة وهم مشمرون۔ [۲]

بارہ ہزار آدمی جن کی پیشانیاں کثرت عبادت کی وجہ سے داغدار ہیں خدا کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اس کثرت سے ان کے ہاتھ تپتی ہوئی خشک ریت کے اوپر رکھے گئے ہیں کہ وہ اونٹ کے پیروں کی طرح سخت ہو گئے ہیں۔ان کا لباس کہنہ اور کھردرا ہے لیکن وہ سخت اور کٹر لوگ ہیں۔

خوارج اسلام کے احکام اور رسوم کے سخت پابند تھے۔جس چیز کو وہ گناہ سمجھتے اس کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ان کے اپنے معیار تھے اور ان معیاروں کے خلاف کسی چیز کا ارتکاب نہیں کرتے تھے اور جس کے ہاتھ سے کوئی گناہ سرزد ہوتا اس سے دور رہتے تھے۔زیاد بن ابیہ نے ان کے کسی آدمی کو قتل کر دیا اور اس کے غلام کو طلب کر کے اس سے اس کے حالات پوچھے۔اس

---

[۱] فجر الاسلام ص ۲۴۳

[۲] العقد الفرید ج۲، ص ۳۸۹

نے کہا کہ نہ میں نے دن کو اسے کھانا پہنچایا اور نہ رات کو اس کے لئے بستر بچھایا دن کو وہ روزہ رکھتا اور رات عبادت میں گذار دیتا۔[۱]

وہ جو بھی قدم اٹھاتے اپنے عقیدے کی راہ میں اٹھاتے اور اپنے تمام افعال میں اپنے مسلک کے پابند تھے اور اپنے عقائد کو پھیلانے کی راہ میں کوشش کرتے تھے۔علی علیہ السلام ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

لَا تَقْتُلُوا الْخَوَارِجَ بَعْدِی فَلَیْسَ مَنْ طَلَبَ الْحَقَّ فَأَخْطَأَهُ كَمَنْ طَلَبَ الْبَاطِلَ فَأَدْرَكَهُ.[۲]

میرے بعد خوارج کو قتل نہ کرو کیونکہ جو حق کو تلاش کرتے اور خطا کو پائے وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے جو باطل کو طلب کرے اور اسے پالے۔

یعنی ان میں اور اصحاب معاویہ میں فرق ہے، یہ حق کو چاہتے ہیں لیکن غلطی میں جا پڑے ہیں لیکن وہ شروع سے ہی دھوکہ باز رہے ہیں اور ان کا راستہ ہی باطل کا راستہ رہا ہے۔اس کے بعد ار تم ان کو قتل کرو گے تو اس کا فائدہ معاویہ کو پہنچے گا جو ان سے بدتر اور زیادہ خطرناک ہے۔

قبل اس کے خوارج کی تمام خصوصیات کو بیان ں کریں لازم ہے کہ یہاں ایک نکتے کا ذکر کریں جو خوارج کے تقدس و تقویٰ اور ان کی زاہد مآبی کے بارے میں ہے اور وہ یہ ہے کہ علی علیہ السلام کی زندگی کی شگفتہ، ممتاز اور غیر معمولی خصوصیات میں سے ایک جس کی مثال نہیں مل سکتی، وہ آپ کا دلیرانہ اور پر جوش اقدام ہے ان تنگ نظر اور مغرور زادہ ان خشک کے مقابلے میں کیا۔ علی علیہ السلام نے ایسے ظاہر الصّلاح اور آراستہ، قیافے سے حق بجانب نظر آنے والے، بوسیدہ لباس اور عبادت پیشہ لوگوں پر تلوار کھینچی اور سب کو موت کے گھاٹ اتارا۔

ہم اگر ان کے اصحاب کی جگہ پر ہوتے اور اس طرح کے قیافے دیکھتے تو یقیناً ہمارے

---

[۱] کامل مبرّد ج۲

[۲] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ٦٠

جذبات برانگیختہ ہوتے اور علی علیہ السلام پر اعتراض کرتے کہ ایسے لوگوں پر تلوار اٹھائی؟!

ان خوارج کی داستان تاریخ اسلام کی عموماً اور تاریخ تشیع کی خصوصاً ایک انتہائی سبق آموز داستان ہے۔علی علیہ السلام اپنے اس کام کی اہمیت اور غیر معمولی حیثیت سے واقف ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَإِنِّي فَقَأْتُ عَيْنَ الْفِتْنَةِ وَلَمْ يَكُنْ لِيَجْتَرِئَ عَلَيْهَا أَحَدٌ غَيْرِي بَعْدَ أَنْ مَاجَ غَيْهَبُهَا وَاشْتَدَّ كَلَبُهَا. [1]

اس فتنے کی آنکھ میں نے نکال دی۔ میرے علاوہ کسی میں ایسے کام کی جرأت نہ تھی جبکہ اس کے تاریکی اور شک پیدا کرنے والے دریا کی لہریں اوپر اٹھ چکی تھیں اور اس کی دیوانگی میں اضافہ ہو چکا تھا۔

امیر المومنین علیہ السلام یہاں دو خوبصورت تعبیریں کرتے ہیں:

ایک اس معاملے کا شک اور تردد پیدا کرنا۔خوارج کے ظاہری تقدس اور تقویٰ کی حالت ایسی تھی کہ راسخ الایمان مومن کو تردد میں مبتلا کر دیتی۔اس اعتبار سے ایک تاریک اور مبہم اور شک سے بھر پور فضا اور دو دلی پیدا ہو گئی تھی۔

دوسری تعبیر یہ ہے کہ آپ ان زاہدان خشک کی حالت کو کَلَب (کاف اور لام پر زبر) سے تشبیہ دیتے ہیں۔کلب یعنی باؤلا پن۔ باؤلا پن دوہری دیوانگی ہے جو کُتّے میں پیدا ہوتی ہے اور وہ ہر ایک کو کاٹتا ہے اور اتفاق سے وہ (کتا) ایک پوشیدہ بیماری (MICROBIC) کا حامل ہوتا ہے، کتے کے دانت جس انسان یا حیوان کو کاٹیں اس کے لعاب دہن کے ساتھ وہ چیز انسان یا حیوان کے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں، وہ بھی دیوانہ ہو جاتا ہے اور کاٹنے لگتا ہے اور دوسروں کو بھی دیوانہ بنا دیتا ہے۔اگر یہ صورت حال جاری رہے تو غیر معمولی طور پر خطرناک ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ عقلمند لوگ ایسے کتوں کو ختم کر دیتے ہیں تاکہ کم از کم دوسرے لوگ دیوانگی کے خطرے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۹۲

سے نجات پائیں۔

علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یہ لوگ باؤلے کتوں کی طرح ہو چکے تھے اور قابل علاج نہ تھے۔ یہ اوروں کو کاٹتے تھے اور مبتلا کر دیتے تھے اور باقاعدہ باؤلوں کی تعداد میں اضافہ کر رہے تھے۔

افسوس! اس وقت کے مسلمانوں کی حالت پر۔ زاہدان خشک کا ایک گروہ، مٹھی بھر جاہل، بے خبر اور ضدی لوگ سب پر حملہ آور تھے۔

وہ کونسی قدرت ہے جو ان بہرے سانپوں کے مقابلے میں کھڑی ہو؟ وہ کونسی قوی اور طاقتور روح ہے جو ان زاہدانہ قیافوں اور تقویٰ کے مقابلے میں ٹھہر سکے؟ وہ کونسا ہاتھ ہے جو ان کے سروں پر وار کرنے کے لئے اٹھے اور نہ کانپے؟

یہی وجہ ہے کہ علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَلَمْ يَكُنْ لِيَجْتَرِءَ عَلَيْهَا أَحَدٌ غَيْرِي

یعنی میرے علاوہ کوئی ایسا اقدام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

علی علیہ السلام جیسے با بصیرت اور علی علیہ السلام جیسے راسخ الایمان کے علاوہ، خدا اور رسول اور قیامت پر ایمان رکھنے والا کوئی مسلمان اپنے اندر یہ جرأت نہیں پا سکتا کہ وہ ان لوگوں پر تلوار اٹھائے۔ ایسے لوگوں کو قتل کرنے کی جرأت صرف وہ کر سکتے ہیں جو اور اسلام پر اعتقاد نہ رکھتے ہوں نہ کہ معمولی مومن اور معتقد افراد۔

یہی بات جس کو علی علیہ السلام اپنے لئے ایک عظیم فخر سمجھتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ میں تھا اور صرف میں کہ جس نے اس بڑے خطرے کا ادراک کیا جو ان زاہدان خشک کی طرف سے اسلام کو لاحق تھا۔ ان کی داغدار پیشانیاں، ان کا زاہدانہ لباس، ان کی ہمیشہ ذکر خدا میں مشغول زبانیں حتّٰی کہ ان کا محکم عقیدہ اور ثابت قدمی (ان میں سے کوئی چیز) مری بصیرت میں مانع نہ ہو سکی۔ وہ میں تھا جس نے سمجھ لیا کہ اگر ان کے پاؤں جم گئے تو سب کو اپنی

بیماری میں مبتلا کر دیں گے اور دنیائے اسلام کو جمود، ظاہر پرستی، سطح پسندی اور تنگ نظری کی طرف لے جائیں گے جس سے اسلام کی کمر جھک جائے گی۔ کیا پیغمبر نے نہیں فرمایا: دو گروہوں نے میری کمر توڑ دی، غیر ذمہ دار عالم اور مقدس مآب جاہل۔

علی علیہ السلام کہنا چاہتے ہیں کہ اگر میں نے عالم اسلام میں خارجیت کا مقابلہ نہ کیا ہوتا اور کوئی ایسا نہ ہوتا جو اس طرح کے مقابلے کی جرأت کرتا۔ میرے سوا کوئی نہ تھا جو یہ دیکھتا کہ وہ گروہ جن کی پیشانیاں کثرت عبادت سے داغدار ہوں، دینی اور مسلکی لوگ ہوں مگر درحقیقت اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہوں، ایسے لوگ جو اپنے خیال میں اسلام کے مفاد میں کام کرتے ہوں لیکن حقیقت میں اسلام کے حقیقی دشمن ہوں، اور ان کے ساتھ جنگ کرسکتا اور ان کا خون بہا سکتا، مگر میں نے یہ کام کر دکھایا۔

علی علیہ السلام کے عمل نے خلفاء اور بعد کے حکام کے لئے راستہ ہموار کیا کہ وہ خوارج سے جنگ کریں اور ان کا خون بہائیں۔ اسلام کے سپاہی بھی بلا چون و چرا ان کی پیروی کرتے تھے کہ علی علیہ السلام نے ان کے ساتھ جنگ کی تھی اور درحقیقت علی علیہ السلام کی سیرت اور دوسروں کے لئے یہ راستہ بھی کھولا کہ بغیر کسی پرواہ کے وہ کسی بھی ظاہر الصلاح، مقدس مآب اور دیندار لیکن احمق گروہ کے ساتھ جنگ کریں۔

(۳) خوارج جاہل اور نادان لوگ تھے۔ وہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے حقائق کو نہیں سمجھتے تھے اور ان کی غلط تفسیر کرتے تھے اور یہی کج فہمیاں آہستہ آہستہ ان کے لئے ایک مذہب اور آئین کی شکل اختیار کر گئیں کہ وہ اس راہ میں بڑی سے بڑی فداکاری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ شروع میں نہی از منکر کے اسلامی فریضے نے ان کو ایک گروہ کی شکل دی جن کا واحد ہدف ایک اسلامی سنت کا احیاء تھا۔

یہاں ہمیں توقف کرنا چاہیے اور تاریخ اسلام کے ایک نکتے پر دقت سے سوچنا چاہیے۔

جب ہم سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورے تیرہ سالہ مکی دور میں کسی کو جہاد حتی کہ دفاع کی اجازت نہ دی یہاں تک کہ مسلمان واقعی تنگ آ گئے اور ایک گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے حبشہ کی طرف ہجرت کی لیکن جو باقی رہ گئے انہوں نے تکلیفیں اٹھائیں۔ یہ ہجرت مدینہ کا دوسرا سال تھا جب جہاد کی اجازت دے دی گئی۔ مکی دور میں مسلمانوں نے تعلیمات دیکھیں، اسلام کی روح سے آشنا ہو گئے اور اسلامی ثقافت روح کی گہرائیوں میں رچ بس گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ پہنچنے کے بعد ان میں سے ہر ایک کا حقیقی مبلغ بن گیا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو جب اطراف واکناف میں بھیجتے تو وہ اپنی ذمہ داریوں سے اچھی طرح عہدہ برآ ہوتے۔ جب وہ جہاد کے لئے روانہ ہوتے تو انہیں اچھی طرح معلوم ہوتا کہ وہ کس ہدف اور کس نظریئے کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔
امیر المومنین علیہ السلام کے الفاظ میں:

حَمَلُوا بَصَائِرَهُمْ عَلَى أَسْيَافِهِمْ.[1]

وہ اپنی بصیرتوں اور روشن اور منظم افکار کو اپنی تلواروں پر اٹھائے ہوئے ہوتے۔

ایسی صیقل شدہ تلواریں ہی تھیں اور ایسے ہی تعلیم یافتہ انسان تھے جو اسلام کے سلسلے میں اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہو سکے۔ جب ہم تاریخ کو پڑھتے ہیں اور ان لوگوں کی گفتگو کو دیکھتے ہیں جن چند سال پیشتر تلوار اور اونٹ کے علاوہ کسی اور چیز کو نہیں پہچانتے تھے، تو ان کے بلند افکار اور ان کی اسلامی ثقافت کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ خلفاء کے دور میں زیادہ تر توجہ فتوحات کی طرف مبذول کی گئی اور دوسرے لوگوں کے لئے متوازی طور پر اسلام کے دروازے کھولنے اور ان کو اسلام کی طرف لے آنے سے غافل رہے کیونکہ اسلام کے نظریۂ توحید اور اسلام کے نظام عدل و مساوات کی کشش عرب و عجم کو اپنی طرف کھینچتی تھی لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلام کی تہذیب وثقافت

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۰

کی تعلیم بھی دی جاتی اور لوگ مکمل طور پر اسلام کی روح سے آشنا ہو جاتے۔

زیادہ تر خوارج عرب تھے اور کم و بیش کچھ غیر عرب بھی ان کے درمیان تھے، لیکن سب کے سب بلا امتیاز عرب و غیر عرب مسلک سے جاہل اور اسلامی ثقافت سے نا آشنا تھے وہ اپنی تمام تر خامیوں کو طویل رکوع و سجود کے زور سے پر کرنا چاہتے تھے علی علیہ السلام ان کی فطرت کی تعریف اسی طرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

جُفَاةٌ طَغَامٌ وَ عَبِيدٌ أَقْزَامٌ جُمِعُوا مِنْ كُلِّ أَوْبٍ وَ تُلُقِّطُوا مِنْ كُلِّ شَوْبٍ مِمَّنْ يَنْبَغِي أَنْ يُفَقَّهَ وَ يُؤَدَّبَ وَ يُعَلَّمَ وَ يُدَرَّبَ وَ يُوَلَّى عَلَيْهِ وَ يُؤْخَذَ عَلَى يَدَيْهِ لَيْسُوا مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَ الْأَنْصَارِ وَ لَا مِنَ الَّذِينَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَ الْإِيمان.[1]

وہ گستاخ، بلند افکار اور لطیف احساسات سے عاری، پست، غلامانہ ذہنیت رکھنے والے، اوباش لوگ ہیں جو ہر کونے سے اکٹھے ہوئے اور ہر کھدرے سے چلے آئے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کو پہلے تعلیم دی جانی چاہیے، ان کو اسلامی آداب سکھا دیا جانا چاہیے اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے باخبر بنا دیا جانا چاہیے۔ ان کی نگرانی کی جانی چاہیے اور ان کے بازوؤں کو گرفت میں رکھا جانا چاہیے نہ یہ کہ ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ ہاتھ میں تلوار اٹھائے اسلام کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار کرتے پھریں۔ یہ نہ ان مہاجرین میں شامل ہیں جنہوں نے اسلام کی خاطر ہجرت کی اور نہ انصار میں جنہوں نے مہاجرین کو اپنے جوار میں قبول کیا۔

مسلک سے بے خبر مقدس مآب طبقے کی پیدائش کہ خوارج بھی اس کا ایک جزو ہیں، اسلام کے لئے انتہائی گراں ثابت ہوئی خوارج سے گزر کر، جو تمام عیوب کے باوجود شجاعت اور فداکاری کی خوبیوں سے بہرہ مند تھے، اس قبیل کا ایک اور ظاہر پرست گروہ بھی وجود میں آ گیا جن میں یہ خوبیاں بھی نہیں تھیں۔ یہ لوگ اسلام کی رہبانیت اور خلوت پسندی کی طرف لے گئے

---

[1] نہج البلاغۃ (للصبحی صالح) / 357 / 238 و من کلام لہ ع فی شان الحکمین و ذم اہل الشام..... ص:357

اور ظاہرداری اور ریا کا بازار گرم کیا۔ چونکہ یہ طاقتور لوگوں پر آہنی تلواریں کھینچنے کی وہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے اس لئے صاحبانِ فضیلت کے خلاف زبان کی تلوار کھینچی اور ہر صاحب فضیلت کی تکفیر ان کو فاسق کہنے اور ان کی طرف بے دینی کی نسبت دینے کا بازار گرم کیا۔ بہرحال خوارج کی ایک ممتاز ترین خصوصیت ان کی جہالت اور نادانی تھی۔ ظاہر یعنی قرآن کے خط اور جلد اور معنی کے درمیان فرق نہ کرسکنا ان کی جہالت کا ایک مظہر ہے۔ اسی لئے انہوں نے معاویہ اور عمرو عاص کی سادہ چال سے دھوکہ کھایا۔

ان لوگوں میں جہالت اور عبادت جڑواں تھیں۔ علی علیہ السلام چاہتے تھے کہ ان کی جہالت کے خلاف جنگ کریں لیکن یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان کے زہد و تقویٰ اور عبادت کے پہلو کو ان کی جہالت کے پہلو سے الگ کر دیا جائے بلکہ ان کی عبادت ہی عین جہالت تھی، جہالت سے جڑی ہوئی عبادت کی علی علیہ السلام کی نظر میں جو اوّل درجے کے اسلام شناس ہیں، کوئی قیمت نہ تھی لہذا انہوں نے ان کی سرکوبی کی اور ان کے زہد و تقویٰ اور عبادت کا پہلو علی علیہ السلام کے مقابلے میں کوئی ڈھال قرار نہ پا سکا۔

ایسے لوگوں اور گرہوں کی جہالت کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ موقعہ پرست لوگوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں اور اسلام کے بلند مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ بے دین منافق لوگ ہمیشہ بیوقوف مقدس لوگوں کو اسلام کے مقاصد کے خلاف بھڑکاتے رہے ہیں اور یہ ان کے ہاتھوں کی تلوار اور ان کے کمان کا تیر بنتے رہے ہیں۔ علی علیہ السلام کس قدر بلند اور لطیف پیرائے میں ان کی اس حالت کو بیان کرتے ہیں: فرماتے ہیں:

ثُمَّ أَنْتُمْ شِرَارُ النَّاسِ وَ مَنْ رَمَى بِهِ الشَّيْطَانُ مَرَامِيَهُ وَ ضَرَبَ بِهِ تِيهَهُ.[1]

---

[1] نہج البلاغۃ (للصبحی صالح) / 184 / 127 و من كلام له علیہ السلام وفيه يبين بعض أحكام الدين و يكشف للخوارج الشبهة و ينقض حكم الحكمين..... ص: 184

پھر تمبد ترین لوگ ہو تم شیطان کے ہاتھ میں اک تیر ہو کہ وہ اپنے نشانے پر مانے کے لئے تمہارے نجس وجود سے استفادہ کرتا ہے اور تمہارے ذریعے سے لوگوں کو شک وتر دد اور گمراہی میں ڈالتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے: شروع میں خوارج کا گروہ ایک اسلامی سنت کے احیاء کے لئے وجود میں آیا لیکن بے بصیرتی اور نادانی نے ان کو اس مقام تک پہنچا دیا کہ وہ قرآنی آیات کی غلط تفسیر کریں اور یہیں سے انہوں نے ایک مذہبی ریشہ پیدا کیا اور مذہب اور طریقۂ زندگی کی حیثیت سے جڑ پکڑی۔قرآن کی ایک آیت ہے۔جس میں خدا نے فرمایا:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ۔[1]

اس آیت میں حکم کو ذات حق کے لئے مختص بتایا گیا ہے لیکن دیکھنا چاہیے کہ حکم سے مراد کیا ہے؟

بیشک یہاں حکم سے مراد انسانی زندگی کا آئین اور اس کے قوانین ہیں۔اس آیت کی رو سے قانون وضع کرنے کا حق غیر خدا سے چھین لیا گیا ہے اور اس کو ذات حق (یا وہ شخص جس کو خدا اختیار دیدے) کا حق قرار دیا ہے لیکن خوارج نے حکم کو، حکومت جس میں حکمیت بھی شامل ہے، کے معنی میں لیا ہے اور اپنے لئے ایک نعرہ تراش لیا اور کہتے تھے لاحکم الا اللہ ان کی مراد یہ تھی کہ وضع قانون کی طرح حکومت، حکمیت اور رہبری کرنے کا حق بھی صرف خدا کے لئے مخصوص ہے اور خدا کے علاوہ کسی کو حق نہیں ہے کہ کسی صورت میں لوگوں کے درمیان حکم یا حاکم ہو، جس طرح کہ قانون وضع کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

کبھی امیر المومنین علیہ السلام نماز میں مشغول ہوتے یا منبر کے اوپر سے خطبہ دے رہے ہوتے، یہ لوگ پکار اٹھتے اور ان سے خطاب کر کے کہتے:

لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰه........لَا لَكَ وَلَا لِأَصْحَابِكَ

[1] سورۂ انعام آیت نمبر ۵۷

اے علیؑ! حاکمیت کا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے۔...................تمہیں یا تمہارے اصحاب کو حق نہیں ہے کہ حکومت یا حکمیت کریں۔

تو وہ جواب میں کہتے:

كَلِمَةُ حَقٍّ يُرَادُ بِهَا بَاطِلٌ نَعَمْ إِنَّهُ لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ وَ لَكِنَّ هٰؤُلَاءِ يَقُولُونَ لَا إِمْرَةَ إِلَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّهُ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ أَمِيرٍ بَرٍّ أَوْ فَاجِرٍ يَعْمَلُ فِي إِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ وَ يَسْتَمْتِعُ فِيهَا الْكَافِرُ وَ يُبَلِّغُ اللهُ فِيهَا الْأَجَلَ وَ يُجْمَعُ بِهِ الْفَيْءُ وَ يُقَاتَلُ بِهِ الْعَدُوُّ وَ تَأْمَنُ بِهِ السُّبُلُ وَ يُؤْخَذُ بِهِ لِلضَّعِيفِ مِنَ الْقَوِيِّ حَتَّى يَسْتَرِيحَ بَرٌّ وَ يُسْتَرَاحَ مِنْ فَاجِرٍ۔[1]

ان کی بات حق ہے لیکن اس سے ان کی مراد باطل ہے۔ یہ درست ہے کہ قانون وضع کرنا خدا کے لئے مختص ہے لیکن یہ لوگ کہنا چاہتے ہیں کہ خدا کے علاوہ کسی کو حکومت کرنا اور امیر نہیں ہونا چاہیے۔لوگ حاکم کے محتاج ہیں خواہ وہ نیکوکار ہو یا بدکار (یعنی کم از کم نیکوکار نہ سمجھا جا سکے) اس کی حکومت کے سائے میں مومن اپنا کام (خدا کے لیے) انجام دیتا ہے اور کافر اپنی دنیوی زندگی سے بہرمند ہوتا ہے یہاں تک کہ خداوند عالم اس کا وقت پورا کرتا ہے۔ یہ حکومت ہی ہے جس کے ذریعے اور جس کے زیر سایہ مالیات جمع ہوتے ہیں، دشمن کے ساتھ جنگ لڑی جاتی ہے، راستے محفوظ اور پرامن ہوتے ہیں، کمزور اور ناتوان کا حق قوی اور ظالم سے دلایا جاتا ہے تاکہ نیکوکار آسائش پائیں اور بدکار کے شر سے محفوظ رہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قانون خود بخود جاری نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ کوئی فرد یا جماعت ہو جو اس کے اجراء کی کوشش کرے۔

(۴) وہ تنگ نظر اور کوتاہ اندیش لوگ تھے۔ وہ انتہائی پست سطح پر سوچا کرتے انہوں نے اسلام اور مسلمانی کو اپنے محدود افکار کی چار دیواری میں محصور کر دیا تھا دوسرے تمام کوتاہ

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۴۰

نظروں کی طرح وہ بھی دعویٰ کرتے تھے کہ سب غلط سمجھتے ہیں یا سرے سے سمجھتے ہیں نہیں ہیں اور سب غلط راستے پر چلتے ہیں اور سب جہنمی ہیں۔ اس قسم کے کوتاہ نظر لوگ سب سے پہلا کام جو کرتے ہیں یہ ہے کہ اپنی تنگ نظری ایک دینی عقیدہ بنا لیتے ہیں، خدا کی رحمت کو محدود کر دیتے ہیں، خداوند عالم کو ہمیشہ غضب کی کرسی پر بٹھاتے ہیں اور اس بات کا منتظر قرار دیتے ہیں کہ اس کے بندے سے کوئی لغزش ہو اور وہ دائمی عذاب کی طرف دھکیلا جائے۔ خوارج کے اصول عقائد میں سے ایک یہ تھا کا گناہ کبیرہ مثلاً جھوٹ یا غیبت یا شراب نوشی کا ارتکاب کرنے والا کافر اور اسلام سے خارج ہے اور جہنم کی آگ کا ابدی طور پر مستحق ہے۔ اس طرح چند ایک کے سوا تمام انسان جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ مذہبی تنگ نظری خوارج کی خصوصیات میں سے ہے لیکن آج اس کو ہم دوبارہ اسلامی معاشرے میں دیکھتے ہیں یہ وہی بات ہے جو ہم نے پہلے کی ہے کہ خوارج کے رسوم فنا ہو چکے اور مر چکے ہیں لیکن ان کے مذہب کی روح کم و بیش بعض افراد اور طبقات میں اسی طرح زندہ اور باقی ہے۔ چند خشک دماغ لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے اور انتہائی گنے چنے اپنے جیسے لوگوں کے علاوہ، دنیا کے سب لوگوں کو کفر اور الحاد کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسلام اور مسلمانی کے دائرے کو انتہائی محدود سمجھتے ہیں۔

سابقہ باب میں ہم نے کہا ہے کہ خوارج اسلامی ثقافت کی روح سے آشنا نہ تھے لیکن بہادر تھے۔ چونکہ جاہل تھے اس لئے تنگ نظر تھے اور چونکہ تنگ نظر تھے جلد کفر اور فسق کا فتویٰ لگاتے تھے یہاں تک کہ اسلام اور مسلمانی کو صرف اپنے آپ میں منحصر سمجھتے تھے اور ان تمام مسلمانوں کو جو ان کے اصول عقائد کو قبول نہ کرتے ہوں، کافر کہتے تھے اور چونکہ بہادت تھے اس لئے صاحبان قدرت کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور اپنے خیال میں ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے اور خود مارے جاتے تھے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے بعد کے ادوار میں ان کا جمود، ان کی جہالت، ظاہر پرستی، مقدق مآبی اور تنگ نظری دوسرے لوگوں میں باقی رہی لیکن شجاعت، بہادری اور فدا کاری ختم ہو گئی۔

بزدل خوارج یعنی ڈرپوک مقدس مآبوں نے آہنی شمشیریں تو کنارے پر رکھ دی ہیں اور قدرت مند لوگوں کو امر بمعروف و نہی از منکر سے، جوان کے لئے خطرہ پیدا کرتے ہیں، آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور زبان کی تلوار کے ساتھ صاحبان فضیلت کی جان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ انہوں نے کچھ اس طرح اور ایسے طریقے سے متّہم کیا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں بہت کم ایسے فضیلت والے پائے جاتے ہیں جو اس طبقے کی تہمت کے تیر کا نشانہ نہ بنے ہو ایک کو انہوں نے منکر خدا کہا، دوسرے کو منکر معاد کہا، تیسرے کو معراج جسمانی کا منکر کہا، چوتھے کو صوفی کہا۔ پانچویں کو کچھ اور۔۔۔ اور اسی طرح۔۔۔ اور اس طریقے سے کہ اگر ہم ان بیوقوفوں کے نظریئے کو معیار قرار دیں تو کسی وقت کوئی عالم مسلمان نظر نہ آئے۔ جب علی علیہ السلام کو کافر قرار دیا گیا تو اوروں کا حال واضح ہے۔ بوعلی سینا، خواجہ نصیر الدین طوسی، صدر المتألہین شیرازی، فیض کاشانی، سید جمال الدین اسد آبادی اور آخر میں محمد اقبال پاکستانی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس جام کا ایک گھونٹ چکّھا ہے۔

بوعلی اسی سلسلے میں کہتا ہے:

کفر چو منی گزاف و آسان نبود
محکم تر از ایمان من ایمان نہ بود
در دھر یکی چو من و آنہم کافر
پس در ہمہ دھر یک مسلمان نبود

میری طرح کافر بننا بھی آسان نہیں ہے میرے ایمان سے زیادہ مضبوط کوئی ایمان نہیں ہے زمانے میں مجھ جیسا ایک آدمی ہو اور وہ بھی کافر پس سارے زمانے میں کوئی ایک بھی مسلمان نہیں ہے

خواجہ نصیر الدین طوسی ایک شخص مسمّی نظام العلماء کی طرف سے تکفیر کا نشانہ بنا۔ وہ کہتا ہے:

نظام بے نظام ار کافر خواند
چراغ کذب را نبود فروغی
مسلمان خوانمش، زیرا کہ نبود
دروغی را جوابی جز دروغی

بے نظام، نظام نے اگر مجھے کافر کہا (تو کہا کرے) جھوٹ کا
چراغ زیادہ نہیں جلتا میں اس کو مسلمان کہتا ہوں کیونکہ وہ مسلمان نہ تھا
جھوٹ کا جواب، جھوٹ کے علاوہ کسی اور چیز سے نہیں دیا جا سکتا۔

بہر حال خوارج کو مشخص اور ممتاز کرنے والی چیزوں میں سے ایک ان کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی تھی کہ سب کو بے دین لا مذہب کہتے تھے علی علیہ السلام نے ان کو اس کوتاہ نظری کے خلاف استدلال کیا کہ یہ کیسی غلط فکر ہے جس کے پیچھے تم چلتے ہو؟ آپ نے فرمایا:

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مجرم کو سزا دیتے تھے اس کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھتے تھے حالانکہ اگر گناہ کبیرہ کا ارتکاب اگر کفر کا موجب ہوتا تو پیغمبر ان کے جنازے کی نماز کبھی نہ پڑھتے کیونکہ کافر کی نماز جنازہ جائز نہیں ہے اور قرآن نے اس سے منع کیا ہے۔ [۱] حضور نے شراب خوار پر حد جاری کی، چور کے ہاتھ کاٹے اور غیر شادی شدہ زنا کار کو کوڑے لگائے پھر ان تمام کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دی اور بیت المال سے ان کا وظیفہ بند نہ کیا اور انہوں نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شادیاں کیں۔ پیغمبر نے ان کے حق میں اسلامی سزاؤں کو جاری کیا لیکن ان کے ناموں کو مسلمانوں کی فہرست سے خارج نہ کیا۔ [۲]

آپ نے فرمایا:

فرض کرو میں نے غلطی کی اور اس کے نتیجے میں کافر ہو گیا پھر تم دوسرے تمام مسلمانوں

---

[۱] سورۂ توبہ آیت نمبر ٤

[۲] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۲۷

کی تکفیر کیوں کرتے ہو؟ کیا کسی کی گمراہی وضلالت اس بات کا موجب بنتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی گمراہی اور خطا پر ہوں اور قابل مواخذہ ہوں؟! کیوں تم ہاتھوں میں تلوار لئے بے گناہ اور گناہ گار۔۔۔تمہاری اپنی نظر۔۔۔تمہاری اپنی نظر میں۔۔۔دونوں کو تلوار کے گھاٹ اتارتے ہو؟![1]

یہاں امیر المومنین دو زاویوں سے ان کے عیوب کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کا دافعہ دونوں زاویوں سے ان کو دفع کرتا ہے، ایک اس زاویئے سے کہ انہوں نے بے گناہ کو گناہ گار قرار دیا ہے اور اس کو مواخذہ کی گرفت میں لیا ہے اور دوسرے اس زاویئے سے کہ انہوں نے ارتکاب گناہ کو کفر اور اسلام سے خارج ہونے کا موجب گردانا ہے یعنی انہوں نے دائرۂ اسلام کو محدود کر دیا ہے کہ جس نے بھی بعض حدود سے باہر قدم رکھا وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔

علی علیہ السلام نے یہاں تنگ نظری اور کوتاہ بینی کی مذمت کی ہے اور در حقیقت علی علیہ السلام کی خوارج کے ساتھ جنگ اس طرز اندیشہ وفکر کے ساتھ جنگ ہے نہ کہ افراد کے ساتھ جنگ۔ کیونکہ افراد اگر اس طرح فکر نہ کرتے تو علی علیہ السلام بھی ان کے ساتھ اس طرح کا رویہ اختیار نہ کرتے۔آپ نے ان کا خون بہایا تا کہ ان کی موت کے ساتھ ان کے خیالات اور افکار بھی مر جائیں، قرآن صحیح طور پر سمجھا جائے اور مسلمان، قرآن اور اسلام کو اس طرح دیکھیں جس طرح کہ ہیں اور جس طرح کہ اس (اسلام) کا قانون بنانے والے (خدا) نے چاہا ہے۔

یہ کوتاہ بینی اور کج فہمی کا نتیجہ تھا کہ وہ قرآن کو نیزے پر بلند کرنے کی سیاست سے دھوکہ کھا گئے اور اسلام کے لئے عظیم خطرے پیدا کئے اور علی علیہ السلام کو جو نفاق کی بیخ کنی اور معاویہ اور اس کے افکار کو ہمیشہ کے لئے نابود کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے، جنگ کرنے سے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۲۷

روک دیا۔ اس کے نتیجے میں کیسے کیسے منحوس حوادث نے اسلامی معاشرے کا رخ نہ کیا؟[۱]
خوارج اپنی اس کوتاہ نظری کے نتیجے میں عملاً تمام مسلمانوں کو، مسلمان نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ذبیحہ کو حلال نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خون مباح سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ شادی بیان نہیں کرتے تھے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ.[۲]

پس ان میں سے ہر گروہ سے کچھ لوگ نہیں نکلتے تا کہ وہ دین میں تفقہہ کریں؟

محض کسی چیز کے درک کر لینے کو اس چیز میں تفقہہ نہیں کہتے بلکہ گہری نظری اور بصیرت تفقہہ ہے۔

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا.[۳]

اگر تم خدا سے ڈرتے ہو تو خدا تمہارے دل میں ایک روشنی کو قرار دیتا ہے جس سے تم اچھے برے کی پہچان اور تمیز کرو۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ[۴]

جو ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم اپنی راہیں ان کو دکھا دیتے ہیں۔

خوارج نے قرآن کے اس طرز تعلیم کے بالکل برعکس جو چاہتا ہے کہ اسلامی فقہ ہمیشہ زندہ اور متحرک رہے، جمود اور ٹھہراؤ کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے اسلامی معارف کو مردہ اور ساکن سمجھ لیا اور ظاہری شاکل اور صورت کو بھی اسلام کے متن میں زبردستی داخل کر دیا۔

---

[۱] جن حوادث نے عالم اسلام کا رخ کیا ان میں مسلمانوں کو پہنچنے والے وہ روحی ومعنوی زخم ہیں جو سب سے زیادہ توجہ کو اپنی طرف جلب کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے دعوت اسلامی کی بنیاد بصیرت اور تفکر کو قرار دیا تھا اور خود قرآن نے لوگوں کے لئے اجتہاد اور ادراک عقل کا راستہ کھولا تھا۔

[۲] سورۂ توبہ:۱۲۲

[۳] سورۂ انفال:۲۹

[۴] سورۂ عنکبوت:۶۹

اسلام نے ہرگز شکل وصورت اور زندگی کے ظاہر پر توجہ نہیں دی ہے۔ اسلامی تعلیمات کی ساری توجہ روح ومعنی اوراس راہ پر ہے جوانسان کوان مقاصداور معانی تک پہنچاتی ہے۔اسلام نے مقاصد ومعانی اوران مقاصد تک پہنچنے کی راہ دکھانے کواپنا دائرہ کار مقرر کررکھا ہے اس کے علاوہ انسان کوآزاد چھوڑا ہے اور یوں تمدن اروثقافت کے پھیلاؤ سے کسی قسم کے تصادم سے پرہیز کرتا ہے۔

اسلام نے کوئی مادّی ذریعہ یا کوئی ظاہری شکل نہیں پائی جس کوتقدّس کا مقام حاصل ہو اور مسلمان اس شکل اورظاہر کی حفاظت کواپنا فرض جان لے۔اس طرح علم اورتمدن کی توسیع کے مظاہرے کے ساتھ تصادم سے پرہیزان اسباب میں سے ایک ہےجس نے اس دین کوزمانے کے تقاضوں کے ساتھ منطبق کرنا آسان بنا دیا ہے اوراس کی ابدی بقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ کوختم کردیا ہے۔ یہ تعقّل ارتدیّن میں توازن ہی ہےجس نے ایک طرف اصول کوثبات اور پائداری بخشی ہےاوردوسری جانب اس کوظاہری اشکال سے الگ کردیا ہے۔کلیات کوواضح کردیا ہےاوران کلیات کے گونا گون مظاہرہیں اور یہ مظاہر بدلتے رہتے ہیں۔لیکن حقیقت (اصول) کوتبدیل نہیں کرتے۔

لیکن مظاہراورمصادیق پرحقیقت کی تطبیق خوداتنا آسان کام نہیں کہ ہرشخص کا کام ہو بلکہ ایک گہرے ادراک اورصحیح سمجھ بوجھ کا محتاج ہےاورخوارج کی فکر میں جمودتھااور جوکچھ سن لیتے اس سے ماوراءکسی چیزکوسمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے،اسی لئے امیرالمومنین علیہ السلام نے جس وقت ابن عباس کوان سے بات چیت کے لئے بھیجا تواس نے فرمایا:

لَا تُخَاصِمْهُمْ بِالْقُرْآنِ فَإِنَّ الْقُرْآنَ حَمَّالٌ ذُو وُجُوهٍ تَقُولُ وَيَقُولُونَ... وَلَكِنْ حَاجِجْهُمْ بِالسُّنَّةِ فَإِنَّهُمْ لَنْ يَجِدُوا عَنْهَا مَحِيصًا.

ان کے ساتھ قرآن سے بحث نہ کرو۔ کیونکہ قرآن بہت سے احتمالات اورتوجیہات کو قبول کرتا ہے جوتم کہو یا وہ کہیں۔ بلکہ سنت اور پیغمبر کے ارشادات کے ساتھ ان سے بحث کرواور

استدلال کرو کہ صریح ہے اور اس سے فرار کا ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔یعنی قران کلیات ہے، بحث کا مقام پر وہ ایک چیز کو مصداق بنا لیتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں تم کسی اور چیز کو، اور یہ صورت حال بحث و مباحثہ کے مقام پر قطعاً نتیجہ خیز نہی ہے۔ وہ اس قدر سمجھ بوجھ نہیں رکھتے کہ قرآن کی کسی حقیقت کو درک کرلیں اور اس کی اس کے صحیح مصداق کے ساتھ تطبیق کریں بلکہ ان کے ساتھ سنت کی بنیاد پر گفتگو کرو جو جزئی ہے اور مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہاں حضرت نے ان کی جمود فکری اور خشک مغری کی طرف اشارہ کیا ہے دراں حالیکہ وہ دیندار تھے جو تعقل اور تدّین میں فرق کی دلیل ہے۔

خوارج صرف جہالت اور فکری جمود کی پیداوار تھے۔ وہ تجزیہ اور تحلیل کی قدرت نہیں رکھتے تھے اور کلی مصداق سے جدا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ اگر کسی خاش مقام پر حکمیت غلطی تھی تو پھر اس کی اساس ہی باطل اور غلط ہے حالانکہ یہ ممکن ہے کہ اس کی اساس محکم اور صحیح ہو لیکن کسی خاص مقام پر اس کا اجراء نارواء ہو لہٰذا تحکیم کی داستان میں ہم تین مرحلے دیکھتے ہیں:

(۱) تاریخ شاہد ہے کہ علی علیہ السلام حکمیت پر راضی نہ تھے۔معاویہ اور اس کے ساتھیوں کی تجویز کو فریب اور دھوکہ سمجھتے تھے اور اس بات پر ان کو سخت اصرار تھا اور ڈٹے ہوئے تھے۔

(۲) کہتے تھے کہ اگر شورای تحکیم کی تشکیل ناگزیر ہے تو ابو موسیٰ ایک بے تدبیر شخص ہے اور اس کام کی صلاحیت نہیں رکھتا، ایک اہل آدمی کا انتخاب ہونا چاہیے اور خود ابن عباس یا مالک اشتر کو تجویز کرتے تھے۔

(۳) حکمیت کا اصول بذاب خود صحیح ہے اور غلط نہیں ہے۔ یہاں بھی علی علیہ السلام کو اصرار تھا ابو العباس مبرد الکامل فی للغۃ والادب ج ۲، ص ۱۳۴ میں کہتا ہے! علی علیہ السلام نے ذاتی طور پر خوارج کے ساتھ مباحثہ کیا اور ان سے کہا: تم خدا کی قسم کھا کر بتاؤ! کیا تم میں سے کوئی بھی میری طرح تحکیم کا مخالف تھا؟

وہ بولے: خدایا! تو گواہ ہے کہ نہ تھا۔

فرمایا: کیا تم نے مجھے مجبور نہ کیا کہ میں قبول کروں؟

بولے، خدایا! تو گواہ ہے کہ ایسا ہی تھا۔

فرمایا: پس تم کیوں میری مخالفت کرتے ہو اور مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے؟

بولے: ہم ایک بڑے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اور ہمیں توبہ کرنی چاہیے، ہم نے توبہ کرلی ہے۔ تم بھی توبہ کرلو۔

فرمایا: استغفر اللہ من کل ذنب،

وہ بھی جو تقریبا چھ ہزار لوگ تھے لوٹ آئے اور کہنے لگے علی علیہ السلام نے توبہ کرلی ہے اب ہم منتظر ہیں کہ وہ حکم دیں اور ہم شام کی طرف کوچ کریں۔

اشعث ابن قیس ان کی خدمت میں آیا اور کہا: کہ لوگ کہتے ہیں آپ تحکیم کو گمراہی سمجھتے اور اس پر قائم رہنے کو کفر سمجھتے ہیں؟

حضرت نے منبر پر گئے، خطبہ پڑھا اور فرمایا: جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میں تحکیم سے پھر گیا ہوں وہ جھوٹ بولتا ہے اور جو شخص اس کو گمراہی سمجھتا ہے وہ خود گمراہ تر ہے۔ خوارج بھی مسجد سے باہر نکل آئے اور دوبارہ علی علیہ السلام کے خلاف شورش کی۔

حضرت فرماتے ہیں کہ یہ مقام اشتباہ تھا۔ اس لئے کہ معاویہ اور اس کے ساتھی حیلہ کرنا چاہتے تھے اور چونکہ ابوموسیٰ نالائق آدمی تھا اور میں خود بھی شروع سے کہتا تھا۔ لیکن تم نے قبول نہ کیا لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ تحکیم کی اساس ہی باطل ہو۔

ایک طرف لوگ حکومت قرآن اور حکومت افراد میں فرق نہیں کرتے تھے۔ حکومت قرآن کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی معاملے میں قرآن کا جو بھی حکم ہے اس پر عمل کیا جائے اور حکومت افراد کے قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ذاتی نظریات اور آراء کی پیروی کی جائے اور قرآن جو خود بات نہیں کرتا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے حقائق کو غور وفکر

کے ساتھ حاصل کیا جائے اور ایسا کرنا بھی افراد کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت خود اس بارے میں فرماتے ہیں:

إِنَّا لَمْ نُحَكِّمِ الرِّجَالَ وَ إِنَّمَا حَكَّمْنَا الْقُرْآنَ هَذَا الْقُرْآنُ إِنَّمَا هُوَ خَطٌّ مَسْطُورٌ بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ لَا يَنْطِقُ بِلِسَانٍ وَ لَا بُدَّ لَهُ مِنْ تَرْجُمَانٍ وَ إِنَّمَا يَنْطِقُ عَنْهُ الرِّجَالُ وَ لَمَّا دَعَانَا الْقَوْمُ إِلَى أَنْ نُحَكِّمَ بَيْنَنَا الْقُرْآنَ لَمْ نَكُنِ الْفَرِيقَ الْمُتَوَلِّيَ عَنْ كِتَابِ اللهِ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى وَ قَدْ قَالَ اللهُ [تَعَالَى عَزَّ مِنْ قَائِلٍ] سُبْحَانَهُ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَ الرَّسُولِ فَرَدُّهُ إِلَى اللهِ أَنْ نَحْكُمَ بِكِتَابِهِ وَ رَدُّهُ إِلَى الرَّسُولِ أَنْ نَأْخُذَ بِسُنَّتِهِ فَإِذَا حُكِمَ بِالصِّدْقِ فِي كِتَابِ اللهِ فَنَحْنُ أَحَقُّ النَّاسِ بِهِ وَ إِنْ حُكِمَ بِسُنَّةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَنَحْنُ أَحَقُّ النَّاسِ وَ أَوْلَاهُمْ بِهَا.[1]

ہم نے لوگوں کو حاکم قرار نہیں دیا ہے بلکہ قرآن کو حاکم قرار دیا ہے اور یہ قرآن جلد کے درمیان تحریریں ہیں، یہ زبان سے بات نہیں کرتا اور بیان کرنے والے کا محتاج ہے لوگ ہیں جو اس کے بارے میں بات کرتے ہیں اور چونکہ اہل شام نے یہ چاہا کہ ہم قرآن کو حاکم قرار دیں، ہم ایسے لوگ نہ تھے جو قرآن سے روگردانی کرتے جبکہ خدا خود قرآن میں فرماتا ہے:

اگر تم کسی چیز کے بارے میں کوئی نزاع رکھتے ہو تو اس کو خدا اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو

خدا کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی کتاب کو حاکم قرار دیں اور اس کی کتاب کے مطابق حکم کریں اور پیغمبر کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی سنت کی پیروی کریں اور اگر خدا کی کتاب کے مطابق صحیح فیصلہ کیا جائے تو ہم اس کے سب سے زیادہ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۲۵

سزاوار ہیں اور اگر اس کے رسول کی سنت کے مطابق فیصلہ ہو تو ہم اس کے لئے اولیٰ ہیں۔

یہاں ایک اشکال ہے کہ شیعہ اعتقاد اور امیر المومنین (نہج البلاغہ خطبہ ۲ آخری حصہ) کے مطابق اسلام میں حکومت اور امامت انتصابی اور مطابق نصّ ہے پس حضرت نے کیونکر حکمیّت کو تسلیم کر لیا اور بعد میں بھی اس کا سختی سے دفاع کیا؟

اس اشکال کا جواب ہم امام کے کلام کے ذیل میں ہی بخوبی سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ جیسا کہ فرماتے ہیں اگر قرآن میں صحیح تدبر کیا جائے اور اس کے مطابق صحیح فیصلہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ ان کی امامت اور خلافت کے علاوہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا اور یہی حال سنت پیغمبر کا بھی ہے۔

اسلامی فرقوں کا ایک دوسرے پر اثر

خوارج کے حالات کا مطالعہ ہمارے لئے اس نقطۂ نظر سے قیمتی ہے کہ ہم سمجھ لیں کہ انہوں نے سیاسی لحاظ سے، عقیدہ وسلیقہ کے لحاظ سے اور فقہ واحکام کے لحاظ سے اسلامی تاریخ پر کیا اثر چھوڑا ہے۔

مختلف فرقے اور گروہ ہر چند رسوم کے چوکھٹے میں ایک دوسرے سے دور ہیں لیکن کبھی ایک مذہب کی روح دوسرے مذہب میں حلول کر جاتی ہے اور وہ مذہب درحالیکہ دوسرے کا مخالف ہے، اس کی روح اور معنی کو قبول کرتا ہے آدمی کی طبیعت (معنی ومفہوم) چراتی ہے کبھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو مثلاً سنی ہیں لیکن روح اور معنی کے اعتبار سے شیعہ ہیں اور کبھی اس کے برعکس کبھی کوئی شخص طبیعتاً شریعت اور اس کے ظاہر کا پابند ہوتا ہے لیکن روح کے اعتبار سے صوفی ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس۔ اسی طرح بعض لوگ بظاہر اور رسوم کے اعتبار سے ممکن ہے شیعہ ہوں لیکن روحاً اور عملاً وہ خارجی ہوں۔ یہ بات افراد پر بھی صادق آتی ہے اور امتوں اور ملتوں پر بھی۔

جب مختلف فرقے ایک ہی معاشرے میں رہتے ہوں ہر چند ان کے رسوم محفوظ ہوں، لیکن ان کے عقائد اور طریقے ایک دوسرے میں سرایت کر جاتے ہیں۔ مثلاً۔۔۔ طبل وترم بجائے کی رسمیں قفقاز کے راسخ العقیدہ لوگوں کے توسط سے ایران میں سرایت کر گئیں اور چونکہ لوگوں کے جذبات ان کو قبول کرنے کے لے ے آمادگی رکھتے تھے، اس لئے بجلی کی طرح ہر جگہ پھیل گئیں۔

اس بناء پر مختلف فرقوں کی روح پر غور کرنا چاہیے۔کبھی کوئی فرقہ حسن ظن اور ضع فعل اخیک علی احسنہ کی پیداوار ہوتا ہے۔مثلاً سنی جو شخصیتوں کے ساتھ حسن ظن کی پیداواری ہیں اور ایک فرقہ ایسا ہے جو ایک خاص نقطہ ءنظر اور افراد شخصیات کی بجائے اصول اسلامی کو اہمیت دینے کے نظریئے کو پیداوار ہے۔ ایسے لوگ قہراً تنقیدی نظر کے حامل ہوں گے جیسے صدر اول کے شیعہ۔ایک فرقہ باطن، روح اور باطن کی تاویل کو اہمیت دینے کے نقطہ ءنظر کی پیداوار ہوگا جیسے صوفیاء اور ایک فرقہ تعصب اور جمود کی پیداوار جیسے خوارج۔

جب ہم فرقوں کی روح اور ان کے ابتدائی تاریخی عوامل کو پہچان لیں تو بہتر طور پر فیصلہ کر سکیں گے کہ بد کی صدیوں میں کون سے عقائد ایک فرقے سے دوسرے فرقے تک پہنچے اور اپنے رسوم اور ناموں کے چوکھٹے میں ہونے کے وصف، ان کی روح کو قبول کر لیا ہے۔اس اعتبار سے عقائد اور افکار زبانوں (نعتوں) کی مانند ہیں کہ بغیر کسی شعوری کوشش کے ایک قوم کی زبان کے الفاظ دوسری قوم کی زبان میں سرایت کر جاتے ہیں جیسا کہ ایران کی فتح کے بعد مسلمانوں کے ذریعے عربی زبان کی الفاظ فارسی زبان میں وارد ہو گئے۔اسی طرح عربی اور فارسی زبانوں میں ترکی زبان کی تاثیر ہے۔مثلاً متوکل کے دور کی ترکی اور سلجوقیوں اور مغلوں کے دور کی ترکی اور یہی حال دنیا کی ساری زبانوں کا ہے اراسی طرح ذوق اور سلیقے بھی ہیں۔

خوارج کے طرز تفکر اور ان کے افکار کی روح فکری جود اور تعقل کو تدین سے علیحدہ کرنا نے تاریخ کے دھارے میں مختلف صورتوں سے اسلامی معاشرے کے اندر رخنہ پیدا کیا ہے۔ اگرچہ تمام اسلامی فرقے ان کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں لیکن خارجیت کی روح کو ہم ان کے طرز فکر میں (کارفرما) دیکھتے ہیں اور یہ اس کے نتیجے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جو ہم نے کہا ہے کہ آدمی کی طبیعت (معنی اور مفہوم کو) چراتی ہے اور باہمی میل جول نے چرانے کے اس عمل کو آسان کر دیا ہے۔

کچھ خارجی مسلک رکھنے والے ہر دور میں رہے ہیں اور ہیں، جن کا وطیرہ ہر نئی چیز کا

مقابلہ کرنا ہے حتی کہ وسائل زندگی کو جن کے بارے میں ہم نے کہا ہے کہ اسلام میں کسی مادی وسیلہ یا ظاہری شکل کو کوئی تقدس کا مقام حاصل نہیں ہے، وہ ان کو تقدس کا رنگ دیتے ہیں اور ہر نئے وسیلے سے استفادہ کرنے کو کفر اور زندقہ سمجھتے ہیں۔

اسلام کے اعتقادی، علمی اور اسی طرح فقہی مکاتب میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے مکاتب ہیں جو تعقل اور تدین میں علیحدگی کی روح کی پیداوار ہیں اور ان کا مکتب جارجیت کی فکر کا صحیح معنوں میں جلوہ گاہ ہے۔ کسی حقیقت کے کشف کی راہ میں یا کسی فرعی قانون کے استخراج کی راہ میں انہوں نے عقل کو مکمل طور پر مسترد کر رکھا ہے اور اس کی پیروی کو بدعت اور بے دینی کہتے ہیں حالانکہ قرآن نے بہت سی آیات میں انسان کو عقل کی طرف بلایا اور انسانی بصیرت کو دعوت الٰہی کا نگہبان قرار دیا ہے۔

معتزلہ جو دوسری صدی ہجری کے اوائل میں وجود میں آئے تھے اور ان کی پیدائش کفر و ایمان کے معنی اور تفسیر کے اوپر بحث اور کاوش کے نتیجے میں ہوئی کہ آیا گناہ کبیرہ کا ارتکاب موجب کفر ہے یا نہیں اور یوں قہراً ان کی پیدائش خوارج کے ساتھ مربوط ہے ایسے لوگ تھے جو کسی قدر آزاد فکر کرنا چاہتے تھے اور ایک عقلی زندگی کو وجود میں لانا چاہتے تھے، اگرچہ وہ علم کے مبادی اور مبانی سے بے بہرہ تھے تاہم اسلامی مسائل کو کسی حد تک آزادانہ غور و فکر اور تدبر کا موضوع قرار دیتے تھے، احادیث پر کسی حد تک تنقید کرتے تھے صرف ان آراء اور نظریات کی پیروی کرتے تھے جن پر ان کے اپنے عقیدے کے مطابق تحقیق کی گئی ہو یا اجتہاد کیا گیا ہو۔

یہ لوگ شروع سے ہی اہل حدیث اور ظاہر پرستوں کی مخالفت اور مقاومت سے دوچار تھے۔ وہ لوگ جو صرف حدیث کے ظواہر کو حجت جانتے تھے اور قرآن اور حدیث کی روح سے کوئی کام نہ رکھتے تھے، وہ عقل کے صریح حکم کی قدر و قیمت کے قائل نہ تھے۔ جس قدر معتزلہ فکر و اندیشہ کی قیمت کے قائل تھے یہ صرف ظواہر کی اہمیت کے اتنے ہی قائل تھے۔

اپنی ڈیڑھ سو سالہ زندگی میں معتزلہ کو عجیب قیاسات (NOTIONS) سے واسطہ پڑا

یہاں تک کہ بالآخر اشعری مذہب وجود میں آیا اور تفکر اور اندیشہ ہائے عقلی اور فلسفیانہ طرز فکر کے سرے سے منکر ہو گئے۔ان کا دعویٰ تھا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ جو روایات ان تک پہنچی ہیں ان کی ظاہری تعبیر پر آنکھیں بند کر کے عمل کریں اور معنی کی گہرائی میں تدبر اور تفکر نہ کریں ہر قسم کا سوال و جواب اور چون و چرا بدعت ہے۔امام احمد بن حنبل جو اہلسنت کے ائمہ اربعہ میں سے ہیں معتزلہ کے طرز فکر کی سخت مخالفت کرتے تھے جس کے نتیجے میں ان کو قید میں ڈال دیا گیا اور کوڑوں کی سزا دی گئی لیکن وہ اپنی مخالفت پر قائم رہے۔بالآخر اشعری کامیاب ہو گئے اور انہوں نے عقلی طرز فکر کی بساط لپیٹ دی اور ان کی کامیابی سے عالم اسلام کی عقلی زندگی پر کاری ضرب لگائی۔اشاعرہ، معتزلہ کو اصحاب بدعت سمجھتے تھے ایک اشعری شاعر اپنے مذہب کی کامیابی کے بعد کہتا ہے:

ذهبت دولة اصحاب البدع

و وهى حبلهم ثم انقطع

و تداعى بانصراف جمعهم

حزب الا بليس الذى كان جمع

هل لهم يا قومفى بدعتهم

من فقيه او امام يتبع[1]

صاحبان بدعت کی قدرت کا زمانہ ختم ہوگیا۔ان کی رسی ڈھیلی پڑ گئی پھر ٹوٹ گئی۔اور وہ گروہ جس کو شیطان نے اکٹھا کر دیا تھا۔انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ گروہ کو منتشر کر دیں۔اے ہم مسلکو! کیا اپنی بدعتوں میں ان کا کوئی قابل تقلید فقیہ یا امام تھا؟

---

[1] المعتزلہ تالیف زہدی جاء اللہ ص ۱۸۵

اخباریوں کا مکتب بھی جو ایک شیعہ مکتب فقہ ہے اور گیارہوں اور بارہوں صدی ہجری میں عروج پر تھا۔ اہلسنت کے فرقوں ظاہریوں اور اہل حدیث کے بہت قریب ہے۔ فقہی نقطہء نظر سے ہر دو مکتب ایک ہیں اور ان کا واحد اختلاف احادیث کی پیروی کے بارے میں ہے۔۔۔ یہ بھی تعقل اور تدین میں فرق کی ایک قسم ہے۔

اخباریوں نے عقل کو مکمل طور پر معطل کر رکھا ہے اور متون سے اسلامی احکام کے استخراج کے سلسلے میں عقل کی کمیت اور حجیت سے مکمل انکار کرتے ہیں اور اس کی پیروی کو حرام سمجھتے ہیں اور اپنی تالیفات میں اصولیین ۔۔۔ ایک اور شیعہ مکتب فقہ کے حامی ۔۔۔ پر سخت برہم ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ صرف کتاب وسنت حجت ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حجیت کتاب بھی تفسیر سنت وحدیث کی راہ سے ہے اور حقیقت میں قرآن کو بھی انہوں نے حجیت سے گرادیا ہے اور صرف حدیث کے ظاہر کو پیروی کے قابل سمجھتے ہیں۔

اس وقت ہم اسلام میں مختلف طرز فکر کا جائزہ لینے اور ان مکاتب کے پیروکاوں پر بحث کرنے کے متحمل نہیں ہیں جو دین کو عقل سے جدا کرتے ہیں جو خارجیت کی روح ہے۔ اس بحث کا دامن بہت وسیع ہے لیکن ہمارا مقصد صرف یہ اشارہ کرنا تھا کہ مختلف فرقوں کا ایک دوسرے پر کتنا اثر ہے اور یہ کہ اگرچہ خارجیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی لیکن اس کی روح ہر اسلامی دور اور ہر صدر میں جلوہ گر رہی ہے۔ آج بھی دنیائے اسلام کے چند روشن فکر اور اہل قلم ان کے طرز فکر کو جدید اور عصری زبان میں لے آتے اور اس کو ایک قابل توجہ فلسفے کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کونوک نیزہ پر بلند کرنے کی سیاست

قرآن کونوک نیزہ پر بلند کرنے کی سیاست تیرہ صدیوں سے مسلمانوں میں کم وبیش رائج ہے۔ خاص طور پر جب مقدس مآب اور ظاہر پرست لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جائے، زہد و تقویٰ کی ظاہر داری کا بازار گرم ہو، موقعہ پرست لوگ قرآن نوک نیزہ پر بلند کرنے کی سیات رائج کر دیتے ہیں۔ یہاں سے جو سبق حاصل کیا جانا چاہیے وہ یہ ہے۔

الف:۔ پہلا سبق یہ ہے کہ جب بھی جاہل، نادان اور بے خبر لوگ پاکیزگی اور تقویٰ کے مظہر سمجھے جانے لگیں اور لوگ ان کو باعمل مسلمان کا نمونہ (SYMBOL) سمجھنے لگیں اس وقت چالاک مفاد پرستوں کو اچھا موقعہ ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ چالاک لوگ ان کو اپنے مقاصد کے لئے آلۂ کار بنا لیتے ہیں اور ان کو حقیقی مصلحین کے افکار کی راہ میں مضبوط رکاوٹ بنا لیتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اسلام دشمن عناصر باقاعدہ اس ذریعے سے فائدہ اٹھاتے ہیں یعنی اسلام کی طاقت کو انہوں نے خود اسلام کے خلاف استعمال کیا ہے۔ مغربی استعمار کو اس ذریعے سے فائدہ اٹھانے کا وسیع تجربہ حاصل ہے۔ اپنے مفاد کے لئے یہ مسلمانوں کے درمیان جھوٹے جذبات ابھارنا اور خاص طور پر فرقے پیدا کر کے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ ایک دل جلا مسلمان بیرونی اثر و نفوذ کو ختم کرنے کے لئے اٹھے اور جن لوگوں کو وہ نجات دینا چاہتا ہے، وہی دین اور مذہب کے نام پر اس کے لئے سدراہ بن جائیں جی ہاں! اگر لوگ عام لوگ جاہل اور بے خبر ہوں، تو منافق خود اسلام کے مورچے سے اپنے لئے استفادہ کریں گے۔ ہمارے اپنے ایران میں جہاں لوگ اہلبیت اطہار کی ولایت اور دوستی پر فخر کرتے ہیں، کچھ منافق اہلبیت کے

مقدس نام پراور ولاءاہلبیت کے مقدس مورچے کے نام پر قرآن، اسلام اور اہل بیت کے خلاف اور غاصب یہودیوں کے مفاد میں مورچے تعمیر کرتے ہیں (یہ قبل از انقلاب اسلامی کی صورت حال کی طرف اشارہ ہے۔ مترجم) اور یہ اسلام، قرآن، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلبیت کرام علیہم السلام پر سب سے زیادہ گھناؤنا ظلم ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي الْفَقْرَ وَلَكِنْ أَخَافُ عَلَيْهِمْ سُوءَ التَّدْبِيرِ.[1]

میں اپنی امت کے لئے فقر وتنگدستی کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں بلکہ امت کی جو چیز مجھے پریشان کرتی ہے وہ کج فکری ہے۔ فکر کا افلاس میری امت کے لئے جتنا خطرناک ہے اقتصادی افلاس اتنا خطرناک نہیں ہے۔

ب: دوسرا سبق یہ ہے کہ ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ قرآن سے استنباط کرنے کا ہمارا طریقہ صحیح ہو۔ قرآن اسی صورت میں رہنما اور ہادی ہے کہ اس پر صحیح غور وفکر کیا جائے، اس کی عالمانہ تفسیر کی جائے اور اہل قران جو علم میں قرآن کے راسخین ہیں، کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جب تک قرآن سے استنباط کرنے کا ہمارا طریقہ صحیح نہ ہو اور جب تک ہم قرآن سے استفادہ کرنے کی راہ اور اس کا اصول نہ سیکھیں ہم اس سے بہرہ مند نہیں ہوسکتے۔ مفاد پرست یا نادان لوگ کبھی قرآن کو پڑھتے ہیں اور بائل مطلب کے پیچھے چلتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے نہج البلاغہ کی زبان سے سنا کہ وہ حق بات کہتے ہیں اور اس سے باطل مراد لیتے ہیں یہ قرآن پر عمل کرنا اور اس کا احیاء نہیں ہے۔ بلکہ یہ قرآن کو مار ڈالنا ہے۔ قرآن پر عمل تب ہے جب اس سے صحیح مطلب درک کیا جائے۔

قرآن ہمیشہ مسائل کو اصول اور کلیہ کی صورت میں پیش کرتا ہے لیکن کلی جزئی پر تطبیق

---

[1] عوالی اللئالی العزیزیة فی الأحادیث الدینیة / ج4 / 39 / الجملة الأولی فی أحادیث متفرقة زیادة فیما تقدم ..... ص: 5

صحیح فہم اورادراک کے اوپر منحصر ہے۔مثلاً قرآن میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ فلان روز علی علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان جنگ ہوگی اور یہ کہ حق علی علیہ السلام کے ساتھ ہے،قرآن میں صرف اس قدر آیا ہے کہ:

وَاِنۡ طَآٮِٕفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا‌ ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ‌ ۚ [1]

اگر مومنون کے دوگروہ آپس میں لڑ پڑیں،توان کے درمیان صلح کرادواور اگران میں سے ایک دوسرے پر سرکشی اورظلم کرے تو جوظالم ہے اس کے ساتھ جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرلے۔

یہ قرآن اوراس کا طرز بیان ہے لیکن قرآن نہیں کہتا کہ فلاں جنگ میں فلاں حق پر ہے اوردوسرا باطل پر؟! قرآن ایک ایک کا نام نہیں لیتا۔ وہ نہیں کہتا کہ چالیس سال بعد یا اس کے بعد معاویہ نام کا ایک آدمی پیدا ہوگا اورعلی علیہ السلام کے ساتھ جنگ کرے گا تم علی علیہ السلام کی طرف سے جنگ کرو اورجزئیات پر بحث ہونی بھی نہیں چاہئے قرآن کے ہیے ضروری نہیں ہے کہ موضوعات کوگن کرحق اور باطل پرانگلی رکھ کے بتادے ایسا ممکن نہیں ہے۔قرآن ہمیشہ رہنے کے لئے آیا ہے پس اسے چاہیے کہ اصول اورکلیات کوواضح کرے تاکہ جب بھی کسی زمانے میں کوئی باطل حق کے بالمقابل کھڑا ہوتولوگ ان کلیات کومعیار بنا کرعمل کریں۔یہ لوگوں کا اپنا وظیفہ ہے کہ اصل دکھادینے (وان طائفتان من المومنین اقتتلوا ۔۔۔ الخ) کے بعداپنی آنکھین کھلی رکھیں اورسرکش اورغیر سرکش گروہ میں تمیم کریں اوراگرسرکش گروہ صحیح معنوں میں سرکشی سے ہاتھ اٹھالے تو قبول کریں اوراگر ہاتھ نہ اٹھالے اور حیلہ کرے اورصرف اس لئے کہ اپنے آپ کو شکست سے بچائے تاکہ نیا حملہ کرنے کا موقعہ پالے اور پھرسرکشی کرنے کے لئے اسی آیت کا جس میں خدافرماتا ہے:

---

[1] سورہ حجرات آیت نمبر ۹

فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا

دامن تھام لے، تو اس کے حیلہ کو قبول نہ کریں۔

ان تمام چیزوں کی تشخیص کرنا خود لوگوں کا کام ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ مسلمان عقلی اور اجتماعی طور پر بالغ ہوں اور اسی عقلی بلوغت کے ساتھ مرد حق اور غیر مرد حق میں تمیز کریں۔ قرآن اس لئے نہیں آیا ہے کہ ہر وقت لوگوں کے ساتھ اس طرح رویہ رکھے جس طرح نابالغ بچے کے ساتھ اس کا ولی عمل کرتا ہے، زندگی کی جزئیات کو کسی کے سرپرست کی حیثیت سے انجام دے اور ہر خاص موضوع کی علامت اور محسوس اشاروں سے تعین کرے۔

بنیادی طور پر اشخاص کی پہچان، ان کی صلاحیتوں، اہلیتوں اور اسلام اور اسلام کے حقائق کے ساتھ ان کی وابستگی کو پرکھنا بذات خود ایک فریضہ ہے اور غالباً ہم اس اہم فریضے سے غافل ہیں۔ علی علیہ السلام فرماتے تھے:

أَنَّكُمْ لَنْ تَعْرِفُوا الرُّشْدَ حَتَّى تَعْرِفُوا الَّذِي تَرَكَهُ.[1]

تم ہرگز حق کو نہیں پہچان سکتے اور راہ راست پر نہیں پہنچ سکتے جب تک اس شخص کو نہ پہچانو جس نے راہ راست کو چھوڑ دیا ہے۔

یعنی صرف اصول اور کلیات کی شناخت کا کوئی فائدہ نہیں ہے جب تک مصداق اور جزئیات سے ان کی تطبیق نہ ہو کیونکہ ممکن ہے افراد یا اشخاص کے بارے میں غلط فہمی کی وجہ سے یا موضوع کو نہ پہچاننے کی وجہ سے تم اسلام، حق اور اسلام کے رسوم کے نام پر اسلام اور حقیقت کے خلاف اور باطل کے مفاد میں کام کر رہے ہو۔

قرآن میں ظلم، ظالم، عدل اور حق کا ذکر آیا ہے لیکن دیکھنا چاہیے کہ ان کے مصداق کون ہیں؟ کہیں ہم کسی ظلم کو حق، اور کسی حق کو ظلم نہ سمجھ رہے رہوں؟ اور پھر انہی کلیات کے تحت اور اپنے خیال میں قرآن کے حکم پر عدالت اور حق کو ختم نہ کر رہے ہوں؟

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۴۷

نفاق کے ساتھ جنگ کرنے کی ضرورت

تمام جنگوں میں سب سے مشکل نفاق کے ساتھ جنگ کرنا ہے کیونکہ یہ ایسے شاطروں کے ساتھ جنگ ہے جو بیوقوفوں کو آلہء کار قرار دیتے ہیں۔ یہ جنگ کفر کے ساتھ جنگ کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ کفر کے ساتھ جنگ میں مقابلہ ایک واضح، ظاہر اور بے پردہ معاملے سے ہے لیکن نفاق کے ساتھ جنگ کرنا ایک پوشیدہ کفر کے ساتھ جنگ ہے۔ نفاق کے دو چہرے ہوتے ہیں ایک ظاہری چہرہ جو اسلام اور مسلمانی کا ہے اور ایک چہرہ باطن کا جو کفر اور شیطنت ہے اور اس کا پہچاننا عام لوگوں اور معمولی افراد کے لئے بہت دشوار ہے اور بسا اوقات ناممکن ہے۔ اس طرح نفاس کے ساتھ جنگ کرنا غالباً شکست کھانا کیونکہ عام لوگوں کے ادراک کی لہریں ظاہر کی سرحد سے آگے نہیں بڑھتیں اور پوشیدہ چیزوں کو روشن نہیں کرتیں اور اتنی گہری نہیں ہوتی کہ باطن کی گہرائیوں میں اتر جائیں۔ امیر المومنین علیہ السلام اس خط میں محمد ابن ابی بکر کو لکھا گیا، فرماتے ہیں:

وَ لَقَدْ قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم إِنِّي لَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي مُؤْمِناً وَ لَا مُشْرِ كاً أَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَمْنَعُهُ اللهُ بِإِيمَانِهِ وَ أَمَّا الْمُشْرِكُ فَيَقْمَعُهُ اللهُ بِشِرْ كِهِ وَ لَكِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ كُلَّ مُنَافِقِ الْجَنَانِ عَالِمِ اللِّسَانِ يَقُولُ مَا تَعْرِفُونَ وَ يَفْعَلُ مَا تُنْكِرُونَ.[1]

پیغمبر نے مجھ سے کہا میں اپنی امت پر مومن اور مشرک سے نہیں ڈرتا کیونکہ مومن کو خدا

---

[1] نہج البلاغہ نامہ ۲۷

اس کے ایمان کی وجہ سے باز رکھتا ہے اور مشرک کو اس کی سرکشی کی وجہ سے رسوا کرتا ہے لیکن تمہارے اوپر منافق دل اور دانا زبان سے ڈرتا ہوں کیونکہ وہ وہی کہتا ہے جو تم پسند کرتے ہو اور جسے تم ناپسند کرتے ہو اسے کر گزرتا ہے۔

اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نفاق اور منافق کی طرف خطرے کا اعلان کرتے ہیں کیونکہ امت کے عام لوگ بے خبر اور نا آگاہ ہیں اور ظاہر داریوں سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

۲) اسی لئے ہم اسلامی تاریخ کے دھارے میں دیکھتے ہیں کہ جب بھی کسی مصلح نے لوگوں، ان کی اجتماعی و دینی زبوں حالی کی اصلاح کی خاطر قیام کیا ہے اور مفاد پرستوں اور ظالموں کا مفاد خطرے میں پڑا ہے انہوں نے فوری طور پر تقدس کا لبادہ پہن لیا ہے اور تقویٰ اور دین کی ظاہر داری سے کام لیا ہے۔ عباسی خلیفہ، مامون الرشید جس کی عیاشیاں اور فضول خرچیاں حکمرانوں کی تاریخ میں مشہور و معروف ہیں جب وہ علویوں کو دیکھتا ہے کہ انقلاب کی کوشش کر رہے ہیں فوراً شاہی جبہ اتار پھینکتا اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہن کر اجتماعات میں آ نکلتا ہے۔ ابو حنیفہ اس کافی جس نے اس کے درہم و دینار سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ہے مامون کے اس کام کو سراہتا ہے اور تعریف میں کہتا ہے:

مامون کز ملوک دولت اسلام

ہرگز چون اوند ید تازی ودہقان

جبہ ای از حزبداشت برتن و چندان

سودہ و فرسودہ گشت بروی و خلقان

مرند مارا از آن فزود تعجب

کردند از وی سوال از سبب آن

گفت ز شاہان حدیث ماند باقی

در عرب و در عجم نہ توزی و کنان

مامون کہ اسلامی ممالک کے بادشاہوں میں اس کی طرح کوئی
نہیں دیکھا گیا، بداور دہقان کی طرح سادہ کسی وت اس کا ریشمی جبہ تھا جو
اس کے دوش پر ہوتا تھا اور بہت نرم ونازک تھا مگر اب وہ پرانا ہوگیا اور
پھٹ چکا ہے، ہم نشینوں کو اس پر سخت تعجب ہوا انہوں نے سوال کیا کہ اس کا
سبب کیا ہے اس نے کہا: بادشاہوں کی ایک بات باقی رہنے دو عرب وعجم
میں کہ اس کے پاس کوئی سلا ہوا سن کا کپڑا نہ تھا

اور دوسروں میں بھی ہر ایک نے قرآن کو نیزہ پر بلند کرنے کی تخریبی گھسی ٹی سیاست کا سہارا لیا اور (مصلحین کی) تمام زحمتوں اور قربانیوں کی سرکوبی کی اور انقلابات کو ابتداء ہی میں کچل دیا اور یہ لوگوں کی جہالت اور نادانی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ وہ رسوم اور حقائق کے درمیان تمیز نہیں کرتے اور اس طرح اپنے اوپر انقلاب اور اصلاح کی راہ بند کرتے ہیں اروا س وقت بیدار ہوتے ہیں جب تمام اسباب بے اثر ہو جائیں اور پھر نئے سرے سے سفر شروع کریں۔

یاد رکھنا چاہیے جتنے احمق لوگ زیادہ ہوں گے نفاق کا بازار اتنا ہی گرم ہوگا۔

احمق اور حماقت سے جنگ کرنا نفاق کے ساتھ جنگ کرنا ہے کیونکہ احمق منافق کا آلۂ کار ہوتا ہے لہٰذا لازمی طور پر احمق اور حماقت کے ساتھ جنگ کرنا، منافق سے اسلحہ چھین لینے اور منافق کے ہاتھ سے تلوار چھین لینے کے مترادف ہے۔

علی علیہ السلام کی سیرت سے جو عظیم نکتے ہمیں ملتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس طرح کی جنگ کسی خاص جمعیت کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ جہاں بھی کچھ مسلمان اور وہ جو وضع دینی رکھتے ہیں اور غیروں کی ترقی اور استعماری مقاصد کو آگے بڑھانے میں آلۂ کار قرار پائیں اور استعمار گر اپنے مفادات کو بچانے کے لئے ان کو آگے کر کے ان کو اپنے لئے ڈھال بنائیں اور ان کے ساتھ جنگ کرنا ان ڈھال بننے والوں کو ختم کیا جائے تا کہ راہ کی رکاوٹ ختم ہو جائے اور دشمن کے قلب پر حملہ کیا جا سکے خوارج کو بگاڑنے کے لئے معاویہ کی کوشش شاید کامیاب تھیں اسی لئے

اس روز بھی معاویہ اور اسی قبیل کے کچھ لوگ جیسے اشعث ابن قیس وغیرہ تخریب کار عناصر نے خوارج کو ڈھال بنا رکھا تھا۔

خوارج کو داستان ہم کو یہ حقیقت سمجھا دیتی ہے کہ ہر انقلاب میں پہلے ڈھال بننے والے کو نابود کر دینا چاہیے اور حماقتوں سے جنگ کرنا چاہیے جس طرح علی علیہ السلام نے تحکیم کے واقع کے بعد پہلے خوارج سے نمٹ لیا اس کے بعد معاویہ کا تعاقب کرنا چاہا۔

علی علیہ السلام سچے امام اور پیشو

وجود علی علیہ السلام، تاریخ وسیرت علی علیہ السلام، خلق وخوئے علی علیہ السلام، رنگ و بوئے علی علیہ السلام، سخن وگفتگوئے علی علیہ السلام سراسر درس ہے، سرمشق ہے، تعلیم ہے اور رہبری ہے۔

جس طرح علی علیہ السلام کے جاذبے ہمارے لئے سبق آموز اور درس ہیں ان کے دافع بھی اسی طرح ہیں ہم معمولاً علی علیہ السلام کی زیارتوں اور اظہار ادب کے سارے پیرایوں میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم تمہارے دوست کے دوست اور تمہارے دشمن کے دشمن ہیں اس جملے کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ ہم اس نقطے کی طرف جا رہے ہیں جو تمہارے جاذبے کے مدار میں قرار پاتا ہے اور تم جذب کرتے ہو اور اس نقطے سے دوری اختیار کرتے ہیں جس کو تم دفع کرتے ہو۔

جو کچھ ہم نے گزشتہ بحثوں میں کہا ہے وہ علی علیہ السلام کے جاذبہ اور واقعہ کا ایک گوشہ تھا، خاص طور پر دافعہ علی علیہ السلام کے بارے میں ہم نے اختصار سے کام لیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ علی علیہ السلام نے دو گروہوں کو سختی سے دفع کیا ہے۔

۱: شاطر منافق ۲: زاہدان احمق

ان کے شیعہ ہونے کے دعویداروں کیلئے یہی دو سبق کافی ہیں کہ وہ اپنی آنکھیں کھولیں اور منافقوں کے فریب میں نہ آئیں۔ وہ تیز نظر رکھنے والے بنیں اور ظاہر بینی کو چھوڑ دیں کہ آج جامعہ تشیع ان دو مصیبتوں میں سخت مبتلا ہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ